دیباچہ طبع اول

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیاً

مولانائے مرحوم کے علمی کمالات میں اگرچہ فارسی اور اردو کی شاعری بھی داخل ہے تاہم انھوں نے بذاتِ خود کبھی اس کو اپنا قابلِ فخر کارنامہ قرار نہیں دیا، اور اس حیثیت سے کبھی اپنے ہمعصروں کی صف میں حریفانہ حیثیت سے کھڑے نہیں ہوتے بلکہ یہ ان کا صرف ایک تفریحی مشغلہ تھا، اور زیادہ تر اس کی تحریک خاص خاص مؤثرات و محرکات کی وجہ سے ہوتی تھی، چنانچہ جب وہ علی گڈہ کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے اور وہاں ان کو قومی زندگی کے مختلف مظاہر نظر آئے تو انھوں نے قصیدہ اور مسدس کی شکل میں بعض نظمیں لکھیں جو وہاں مختلف عظیم الشان جلسوں میں پڑھی گئیں، ان کے علاوہ علی گڈہ کی جدید تحریک کے متعلق انھوں نے ایک مستقل مثنوی "صبح امید" کے نام سے لکھی جو نہایت مقبول ہوئی، اس کے بعد ایک مدت تک انھوں نے اردو شاعری کو ہاتھ نہیں لگایا، اور جو کہتے رہے فارسی زبان میں کہتے رہے لیکن ان کی اخیر زندگی میں اندرونی و بیرونی مؤثرات و محرکات نے ان کو دوبارہ اس طرف متوجہ کیا، اور تصنیف سیرت، منسوخی تقسیم بنگال، ہنگامۂ جنگِ بلقان، قیام مسلم یونیورسٹی، مسلم لیگ، اور نزاعات و مناقشات ندوہ کے پیہم و متصل اثرات نے ان کے زود اشتعال جذبات میں ایک آگ سی لگادی اور انھوں نے ان سے متاثر

ہو کر اردو میں بکثرت مذہبی، اخلاقی اور سیاسی نظمیں لکھیں جو ملک میں نہایت مقبول ہوئیں، اور اس حسنِ قبول کی بنا پر دہلی، لاہور، اور علی گڈہ سے ان نظموں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے، جن میں سب کے سب ناقص اور غیر مکمل تھے اور بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کی عام مقبولیت کو دیکھ کر ان سے وقتی طور پر صرف تاجرانہ فائدہ اٹھانا مقصود تھا، ان سب کے بعد حاجی ظفر الملک علوی نے ۱۹۱۸ء میں ان نظموں کا ایک مجموعہ "مجموعۂ کلام شبلی" کے نام سے شائع کیا، جو ان سب میں سب سے زیادہ مکمل تھا، لیکن ان نظموں کے علاوہ مولانا کی اور بھی متعدد نظمیں اردو میں تھیں، جن کو دار المصنفین اس سے بھی زیادہ مکمل مجموعہ شائع کرنے کے لئے نہایت خاموشی کے ساتھ جمع کر رہا تھا، اور ان تمام کوششوں کے اخیر میں "کلیاتِ شبلی" اسی اخیر کوشش کا نتیجہ ہے، جس کو "مجموعۂ کلام شبلی" پر چند نظموں کے اضافہ کے علاوہ یہ مزیت بھی حاصل ہے کہ اس مجموعۂ کلام شبلی میں تمام نظمیں باہم مخلوط تھیں اور ان میں کسی قسم کی تبویب و ترتیب کا خاص لحاظ نہیں رکھا گیا تھا، لیکن اس مجموعہ میں مذہبی، اخلاقی اور سیاسی نظموں کے الگ الگ عنوان قائم کئے گئے ہیں اور ان کے تحت میں صرف وہی نظمیں درج کی گئی ہیں جو ان عنوانوں سے خاص تعلق رکھتی تھیں، اس کے ساتھ متعدد نظموں کی ابتدا میں مختلف نوٹ بھی لکھے گئے ہیں، جن سے ان کی مزید تشریح ہوتی ہے، وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ،

سید سلیمان ندوی

۱۹۲۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا شبلی اردو شاعر کے لباس میں

مولانا شبلی نعمانی شاعر نہ تھے، مولانا شبلی شاعر تھے، دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں، وہ شاعر نہ تھے، کیونکہ ان کا نام شاعروں کی فہرست میں نہیں، اور پبلک میں شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت نہیں، لیکن وہ شاعر تھے، کیونکہ ان کا اردو اور فارسی کا دیوان موجود ہے، علی گڈہ کالج، علی گڈہ ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوۃ العلماء لکھنو کے جلسوں میں وہ بڑی دھوم دھام سے اپنی نظمیں پڑھتے اور اپنے قصیدے سناتے تھے، سننے والے سر دھنتے آنسو بہاتے اور قدر جاننے والے ان کی زبان کی فصاحت، معنی کی بلاغت، اور طرز ادا کی خوبی کو مانتے تھے، مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی ہماری زبان کے مشہور مقرر تھے، ان کی عادت تھی کہ اپنے لکچر سے پہلے اپنی سیدھی سادی نظم بھی سنا دیا کرتے تھے، اپنی اسی قسم کی ایک نظم میں اپنے شعروں کی بے اثر کیفیت کو دیکھ کر کہتے ہیں،

تم اپنی نثر کو یو نظم کو چھوڑ دو نذیر احمد | کہ اس کے واسطے موزوں ہیں حالی اور نعمانی

مولانا حالی کی شاعری تو مشہور ہے، مگر مولانا شبلی نعمانی کی شاعری ان کے علمی کمالات کے ڈھیر میں ایسی چھپ گئی کہ وہ بہت کم لوگوں کو نظر آئی۔

مولانا شبلی مرحوم بچپن سے شاعر تھے، ان کے بچپن کے ایک استاد کہتے تھے کہ جب مولانا شبلی بچہ تھے، اور چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑھتے تھے تو ان کو اوڑھنے کی ایک چادر کی ضرورت ہوئی، ان کے باپ اعظم گڈھ کے نامور وکیل تھے، تو بیٹے نے باپ سے زبانی کہنے کے بجائے یہ شعر کاغذ پر لکھ کر دیا،

پدر جس کا یوں صاحب تاج ہو

پسر اس کا چادر کو محتاج ہو

باپ بہت خوش ہوئے اور بیٹے کو چادر انعام دی،

مولانا شبلی جب اوپر کی کتابیں پڑھنے لگے تو اردو اور فارسی میں شعر کہنے لگے، فارسی شاعری کا ذوق تو بہت اچھا تھا، مگر اردو شاعری ایسی ہی تھی جیسے اکثر نوجوان علم کے زور یا جوانی کے جوش سے شعر کہنے لگتے ہیں، حاضر جوابی یہ تھی کہ فوراً شعر کہتے تھے، ان کے عربی اور فارسی کے استاد مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی تھے، شاگرد ایک دفعہ ننگے سر بیٹھا تھا، استاد نے آکر پیچھے سے سر پر ایک ہلکی سی چپت لگائی اور خوش طبعی سے فرمایا،

ہو گا چپت گاہِ خلائق یہ سر

شاگرد نے فوراً جواب دیا،

جتنے بھی ہیں سر اُن پہ ہے فائق یہ سر

اعظم گڈھ میں ایک کتب فروش تھے جو اردو کے دیوان بھی بیچتے تھے،

مولانا کو اپنے بچپن میں شعر و سخن کا شوق اتنا تھا کہ چھٹیوں کے اوقات میں انکی دکان پر پہنچ جاتے تھے اور وہیں بیٹھکر دیوان پڑھا اور دیکھا کرتے تھے، اور چونکہ طبیعت کو مناسبت تھی اس لئے بیسیوں شعر ان کو یاد ہو جاتے تھے، اور لوگوں کو ان کے اس حافظہ پر تعجب ہوتا تھا،

مولانا کی جوانی کے زمانہ میں شعر و سخن کا عام چرچا تھا، ہر پڑھا لکھا آدمی کچھ نہ کچھ اس سے دلچسپی لیتا تھا، شہروں میں مشاعروں کی مجلسین ہوتی تھین، نوجوان اور بوڑھے شوق سے شریک ہوتے تھے، اور دادِ سخن دیتے تھے، مولانا بھی اپنے وطن اعظم گڈہ میں اسی قسم کی مجلسین کرتے تھے، غزلیں پڑھی جاتی تھیں، واہ واہ ہوتی تھی، سبحان اللہ اور جزاک اللہ کے نعرے بلند ہوتے تھے،

اس زمانہ میں مولانا کا تخلص تسنیم تھا، خیال ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں منشی امیر اللہ صاحب تسلیم لکھنوی کی شہرت تھی، اسی لئے تسلیم کے وزن پر تسنیم کا تخلص پسند کیا گیا، لیکن اس کے بعد انھون نے خود اپنے نام شبلی کو تخلص قرار دیا، مولانا شبلی نے کچھ دن ۱۸۷۴ء کے قریب غازیپور کے مدرسہ چشمۂ رحمت میں گذارے تھے، وہاں اردو کے مشہور شاعر شمشاد لکھنوی مدرس تھے، وہ اچھے شاعر تھے، ان کے دیوان چھپ چکے ہین، اور مولانا سے ان کو تعلق بھی تھا،

مولانا کی فارسی شاعری کے اصل استاد مولوی فاروق صاحب چریا کوٹی تھے، جو فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے، اسی کے ساتھ اردو میں بھی نظمین کہا کرتے تھے، ان میں سے دو مسدس ان کے چھپے ہوسے ہیں، مسدس فاروقی، اور مسدس عوالی، پہلے میں مئو ضلع اعظم گڈہ کے ۱۸۹۳ء کے بلوہ کی روداد ہے، اور دوسرے

ہیں مولنا حالی کے مشہور مسدس کا جواب لکھا ہے،

مولانا شبلی کی اردو شاعری بالکل خودرو پودا ہے، نہ انھوں نے اس میں کسی سے اصلاح لی، نہ جم کر کبھی اردو کی شاعری کی اور نہ کبھی اردو شاعری کو عزت اور شہرت کا ذریعہ سمجھا، یہاں تک کہ ۱۸۸۳ء میں علی گڈھ سے جانے سے پہلے وہ اردو میں خط و کتابت کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے، اس زمانہ کے اہل علم کی طرح وہ فارسی ہی میں خط لکھتے تھے، اور غالب کی طرح محنت سے لکھتے تھے "سیرۃ النعمان" جو ۱۸۸۷ء میں لکھی ہے اس تک میں یہ لکھا ہے، ع

"حرف بہ اردو زدن آئین نہ بود"

یعنی اردو میں لکھنا میرا دستور نہ تھا، مگر کیا عجیب بات ہے کہ جس زبان میں لکھنا پڑھنا ان کے لئے عار تھا، وہی ان کی شہرت اور ان کی غیر فانی زندگی کا سبب بن گئی،

مولانا کی اردو شاعری کے چار دور ہیں،

پہلا — شروع سے ۱۸۸۳ء تک جب وہ علی گڈھ کالج گئے ہیں،

دوسرا — علی گڈھ کے قیام کا زمانہ، ۱۸۹۸ء تک،

تیسرا — حیدرآباد کا زمانہ اور کچھ لکھنؤ کا، یعنی ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۸ء تک

چوتھا — ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء تک جس میں انھوں نے وفات پائی،

پہلا دور پہلے دور کی یادگار ان کی چند غزلیں، ایک قصیدہ، اور ایک لمبی نظم ہے، غزل کا نمونہ یہ ہے،

ضعف میں بھی یہ مرے تیر فغاں میں زور ہے — روک لے اسکو کہاں یہ آسماں میں زور ہے

نیست تھی اسکی کمر پر تو نے ثابت کر دیا — واہ وا تسلیم کیا تیرے بیاں میں زور ہے

اس زمانہ کا قصیدہ سلطان عبدالحمید خاں کی تعریف میں ہے، زمین وہی ہے جو انشا کے اس مشہور قصیدہ کی ہے،

بگھیاں پھولوں کی تیار کرا بوئے سمن | کہ ہوا کھانے کو نکلینگے جوانانِ چمن

مولانا فرماتے ہیں، اور کس قدر پرجوش فرماتے ہیں، تشبیہیں اور استعارے کیسے نازک ہیں،

پھر بہار آئی ہی شاداب ہین پھر دشت و چمن | بن گیا رشکِ گلستانِ ارم پھر گلشن
شعلہ زن پھر چمنستاں میں ہوئی آتشِ گل | پھر صبا چلتی ہی گلشن میں بچا کر دامن
آگ پانی میں لگا دی ہی کسی نے شاید | حوض میں عکسِ گل و لالہ ہی یا جلوہ فگن
باغ میں بادِ بہاری کی جو آمد کی ہی دھوم | بہرِ تسلیم ہر اک شاخ کی خم ہے گردن
مسند آرائے تجمل جو ہوا شاہدِ گل | مرغ گلشن میں صدا دیتے ہیں الملک لمن
شاخیں انگڑائیاں لیتی ہیں صبا ہی بدمست | وجد میں تال لگاتا ہی ہر اک برگِ سمن
سر نگالے ہیں حبابوں نے تہِ آب سے کیوں | نظر آتی نہ تھی پانی میں مگر سیرِ چمن
چونکتے ہیں جو کبھی خواب سے اطفالِ بہار | تھپکیاں دیتی ہی سونے کیلئے بادِ چمن

اسی زمانہ کی یادگار ان کی ایک لمبی نظم ہے، کسی انگریز شاعر نے انگریزی میں قندہار اور کابل کی لڑائی کا حال نظم کیا تھا، جس میں اس فوج کے انگریز افسروں کی تعریفیں ہیں، ان میں سے کوئی انگریز بدل کر اعظم گڈہ آیا تھا، اس کی فرمایش سے اس کی انگریزی نظم کا اردو میں ترجمہ فرمایا،

لو سنو تیغ و سناں کی داستاں | رایت و طبل و نشان کی داستان
پہلوانانِ جہاں کی داستاں | شاہ کے اعزاز و شان کی داستان

حکمرانِ بحر و بر کی فتح ہے
قیصر ہندوستاں کی فتح ہے

یہ ویسی ہی نظم ہے جیسی ایک فرمائشی نظم ہونی چاہئے،

مولانا کے پہلے دور کی اردو شاعری کی کل کائنات یہی ہے،

دوسرا دور | دوسرے دور میں ان کی چند غزلیں ہیں جو اس طرح محفوظ رہ گئی ہیں کہ انھوں نے اسی زمانہ میں علی گڈھ سے آپ اپنے بعض عزیزوں کے خطوں میں لکھکر انکو بھیجا، اور چونکہ وہ خط ان کے خطوں کے مجموعہ میں جس کا نام "مکاتیب شبلی" ہے چھپ گئے ہیں، اس لئے وہ غزلیں عام نگاہوں کے سامنے آگئی ہیں،

مولانا علی گڈھ جنوری ۱۸۸۳ء میں گئے، اور ایک ایسے محلہ میں مکان لیکر رہے جو خواجہ محمد یوسف صاحب وکیل (خواجہ عبدالمجید بیرسٹر کے والد) کے پڑوس میں تھا، ان کے ہاں ایک شاعر جو قیس تخلص کرتے تھے، رہتے تھے، مولانا کی آمد و رفت ان کے ہاں رہتی تھی، اور شعر و شاعری کا شغل رہتا تھا، ایک اور صاحب عبدالحمید صاحب تھے جو گو شاعر تھے مگر دیوانوں کے دیوانہ تھے، ان سے بھی ملتے تھے، پھر اس وقت میر اکبر حسین صاحب جو اکبر الہ آبادی کے نام سے مشہور ہیں علی گڈھ میں منصف تھے، اتحادِ مذاق نے دونوں کو ملا دیا تھا،

کالج میں جو مختلف قومی تقریبیں ہوتی تھیں، ان میں مولانا عام طور سے اپنے فارسی قصیدے پڑھا کرتے تھے، لیکن اس زمانہ میں مولانا حالی بھی آکر اکثر علی گڈھ میں رہا کرتے تھے، اور ان کا مسدس جو ۱۸۷۹ء میں چھپ کر مقبول ہو چکا تھا، اس سے اردو نظموں اور قصیدوں کا شوق ان کے دل میں پیدا ہوا، اس لئے

کبھی کبھی اردو نظمیں، اور قصیدے بھی انھوں نے کہے،

غزل | اس دور میں انھوں نے جو اردو غزلیں کہیں ان کی کائنات تین چار سے زیادہ نہیں، اور یہ مشغلہ صرف دو برس رہا یعنی ۱۸۸۳ء اور ۱۸۸۴ء میں' ان غزلوں میں سوائے غزل ہونے کی کوئی خاص خوبی نہیں، اس دور کی پہلی غزل کا مطلع ہے،

تیر قاتل کا یہ احساں رہ گیا — جائے دل سینہ میں پیکاں رہ گیا
کی ذرا دستِ جنوں نے کوتہی — چاک آکر تا بداماں رہ گیا
حسن چمکا یار کا اب آفتاب — اک چراغ زیرِ داماں رہ گیا
بزم میں ہر سادہ رو تیرے حضور — صورتِ آئینہ حیراں رہ گیا

مقطع ہے،

یاد رکھنا دوستو اس بزم میں — آکے شبلیؔ بھی غزل خواں رہ گیا

جنوری ۱۸۸۴ء میں ان کی دوسری غزل ہے،

× × × — اب جو تشریف صبا لائی ہے
نکہتِ زلف، غبارِ رہِ دوست — آخر اس کوچہ سے کیا لائی ہے
مجھ کو لے جا کے مری آنکھ وہاں — اک تماشا سا دکھا لائی ہے

۲۶ر جنوری ۱۸۸۴ء کو دو غزلیں بھیجیں، پہلی یہ ہے،

پوچھتے کیا ہو جو حالِ شبِ تنہائی تھا — رخصتِ صبر تھی یا ترکِ شکیبائی تھا
شبِ فرقت میں دلِ غمزدہ بھی پاس نہ تھا — وہ بھی کیا رات تھی کیا عالمِ تنہائی تھا
انگلیاں اٹھتی تھیں مژگاں کی اسی رخ پیہم — جس طرف بزم میں وہ کافر ترسائی تھا

دوسری غزل

تیس دن کیلئے ترکِ مے و ساقی کرلوں
واعظِ سادہ کو روزوں میں تو راضی کرلوں

اور پھر کس کو پسند آئیگا ویرانۂ دل
غم سے مانا بھی کہ اس گھر کو میں خالی کرلوں

۸ر فروری ۱۸۵۴ء کو ایک غزل لکھی،

یار کو رغبتِ اغیار نہ ہونے پائے
گلِ تر کو ہوسِ خار نہ ہونے پائے

چپکے وہ آتے ہیں گلگشت کو اے بادِ صبا
سبزہ بھی باغ میں بیدار نہ ہونے پائے

ان غزلوں میں گو کوئی خاص ندرت نہیں، پھر بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ فارسی ترکیبوں سے وہ اپنے کلام کو زینت دینا چاہتے تھے، اور اس کا ان کو خاص سلیقہ تھا۔

مثنوی اس دور میں مولانا نے ایک مثنوی، ایک مسدس اور دو قصیدے لکھے، میرا خیال ہے کہ ان کی یہ مثنوی جس کو انھوں نے اپنی تصنیفات سے باہر کردیا تھا خاص چیز ہے، اس وقت تک مثنوی صرف قصوں کہانیوں کے لئے تھی ابھی تک اس کو قومی مقصد کے لئے کام میں نہیں لایا گیا تھا، بلکہ اب بھی وہ اس فیض سے گویا محروم ہی ہے، مولانا نے اس راہ میں پہل کی، اور وہ چیز جو اب تک میر حسنؔ مرزا شوقؔ اور پنڈت دیا شنکر نسیمؔ کی سحر بیانیوں سے صرف حسن و عشق اور سحر و طلسم کا تماشا گاہ تھی، وہ قومی ترقی و تنزل کا عبرت انگیز منظر بنگئی، لفظ فصیح، معنی بلند، ترکیبیں دلپذیر، تشبیہ اور استعارے نازک، حشو و زائد سے پاک اور بیان پُر اثر، اور یہی چیزیں مثنوی کی جان ہوتی ہیں،

مثنوی ان شعروں سے شروع ہوتی ہے،

کیا یاد نہیں ہیں وہ ایام
جب قوم تھی مبتلائے آلام

وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی — جو تاج تھی فرقِ آسماں کی
گل کر دیئے تھے چراغ جس نے — قیصر کو دیئے تھے داغ جس نے
وہ نیزۂ خوں فشاں کہ چل کر — ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر
روما کے دھوئیں اُڑا دیئے تھے — اٹلی کو کوئیں جھکا دیئے تھے

تنزل کا نقشہ اس طرح دکھایا ہے،

جس چشمہ سے اک جہاں تھا سیراب — وہ سوکھ کے ہو رہا تھا بے آب
پستی نے دبا لیا فلک کو — خورشید ترس گیا چمک کو
اب خضر کو گمرہی کا ڈر ہے — عیسیٰ کو تلاشِ چارہ گر ہے
جو ابر ابھی برس گیا ہے — اک بوند کو اب ترس گیا ہے
کس نیند میں سو گئی تھیں آنکھیں — بیکار سی ہو گئی تھیں آنکھیں
بیکار تھا بے نظام تھا دل — پہلو میں برائے نام تھا دل

تنزل کا یہ پورا نقشہ دکھا کر سرسید کی تحریک کا ذکر کیا ہے،

ماتم تھا یہی کہ آئی ناگاہ — اک سمت سے اک صدائے جانکاہ
اس شان سے تھی وہ آہِ دلگیر — پہلو میں اثر۔ بغل میں تاثیر
ڈوبی ہمہ تن جو تھی اثر میں — نشتر سی اتر گئی جگر میں

سرسید کی تصویر،

صورت سے عیاں جلالِ شاہی — چہرہ پہ فروغِ صبحگاہی
وہ ریشِ دراز کی سپیدی — چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں اک ذرا خم — توقیر کی صورتِ مجسم

خاتمہ کے شعر یہ ہیں،

اسلاف کے وہ اثر ہیں اب بھی — اس راکھ میں کچھ شرر ہیں اب بھی

اس حال میں بھی روش وہی ہو — دن ڈھل بھی گیا، طپش وہی ہو

اس جام میں ہے شراب باقی — اب تک ہے گہر میں آب باقی

گو خوار ہیں طرز و خو وہی ہو — مرجھا گئے پھول بو وہی ہو

ان شعروں سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ شاعرانہ خوبیوں کے لحاظ سے یہ مثنوی مصنف کے رتبہ سے کم نہیں ہے،

مسدس ۱۸۹۴ء میں سرسید نے علی گڈہ کی سالانہ نمایش کے موقع پر "تماشائے عبرت" کے نام سے عبرت کا تماشا دکھایا تھا، جس میں سرسید اور ان کی تحریک کے دوسرے ناموروں نے لباس اور حلیہ بدل کر تقریریں کیں اور نظمیں پڑھی تھیں، اس موقع پر مولانا شبلی نے اردو میں ایک مسدس پڑھا تھا، یہ کہنا رہ گیا کہ مولانا شبلی کے پڑھنے کا ایک خاص مؤثر انداز تھا، اور وہ اپنی نظمیں اسی دھن میں پڑھتے تھے جس کو سنکر سننے والے اثر میں ڈوب جاتے تھے، اور سر دھننے لگتے تھے، ان کی یہ لے اتنی پھیلی کہ علی گڈہ کالج کے لڑکوں اور قومی جلسوں سے نکل کر اب مشاعرہ کی محفلوں تک پہنچ گئی تھی، مگر اس وقت یہ بات بالکل نئی تھی، مولانا نے اس تماشاگاہ میں جب اپنے مسدس کے یہ بند پڑھے ہیں تو ایک سماں بندھ گیا تھا،

ہم نے مانا بھی کہ دل سے یہ بھلادیں قصے — یہ سمجھ لیں کہ ہم ایسے ہی تھے اب ہیں جیسے

یہ بھی منظور ہے ہم کو کہ ہمارے بچے — دیکھنے پائیں نہ تاریخ عرب کے صفحے

کبھی بھولے بھی سلف کو نہ کریں یاد اگر

یادگاروں کو زمانہ سے مٹادیں کیونکر

مرو شیراز و صفاہاں کے وہ زیبا منظر　　بیت حمرا کے وہ ایوان وہ دیوار وہ در

مصر و غرناطہ و بغداد کا اک اک پتھر　　اور وہ دہلی مرحوم کے بوسیدہ کھنڈر

اُنکے ذروں میں چمکتے ہیں وہ جوہر ابتک

داستانیں انھیں سب یاد ہیں ازبر ابتک

اس مسدس کے ۱۴ بند ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ شاعرانہ استادی کے لحاظ سے یہ مولانا حالی کے مسدس سے کم ہے،

قصیدے اس دور میں مولانا نے اردو کے تین قصیدے لکھے ہیں، ایک وہ ترکیب بند ہے جس کو ۱۸۹۳ء کے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھا تھا،

بجا ہے آج اگر اس بزم میں یہ زیب ساماں ہیں　　یہ انکی بزم ہے جو یادگار نسل عدناں ہیں

خلیل اللہ سے مہماں نوازی جنکو پہنچی ہے　　ہزاروں کوس سے آ کے وہ اس گھر میں مہماں ہیں

یہ قصیدہ تین بندوں میں تمام ہوا ہے، تاریخی واقعات سے مسلمانوں کو عبرت دلائی، اور ترقی کی روح پھونکی گئی ہے،

تیسرا قصیدہ بھی مولانا نے کسی جلسہ ہی میں پڑھا تھا، اسی کو تماشا گاہ عبرت میں ۱۸۹۴ء میں ایک طالب علم نے پڑھ کر سنایا تھا، مطلع یہ تھا،

بزم احباب ہے پرجوش ہے جلسا کیسا　　جم گیا پھر طرب و عیش کا نقشا کیسا

اس قصیدہ میں بعض تشبیہیں اچھوتی ہیں،

صفحۂ عیش کی سطریں ہیں برابر دیکھو　　حسن و خوبی سے یہ مجمع ہے صف آرا کیسا

نوجواں جمع ہیں یا جوش کی تصویریں ہیں　　میں نے اس بزم کا کھینچا ہے سراپا کیسا

اب بھی اس راکھ میں تھوڑے سے شرر ہیں پنہاں	اب بھی اک فتنہ ہے یہ شاہد زیبا کیسا

مقطع ہے،

اے حریفو! تمھیں خالق کی قسم سچ کہنا	شبلیؔ خستہ نے لکھا یہ قصیدا کیسا

چوتھا قصیدہ آنریبل جسٹس سید محمود کی شادی کی مبارکباد میں ہے، موقع بھی یہ خوشی کا تھا، اس لئے مولانا کا یہ قصیدہ بھی باغ و بہار ہے، فرماتے ہیں،

پھر ہوا بادِ بہاری کا جو عالم میں عمل	چھا لیا سبزۂ نوخیز نے سب دشت و جبل

ناز سے سوئے چمن جاتی ہے پھر بادِ بہار	جھومتے آتے ہیں، پھر صحنِ چمن میں بادل

نوعروسانِ چمن کے ہیں نرالے انداز	کہ صبا گود میں لیتی ہے تو جاتے ہیں مچل

سمت قبلہ سے جو اٹھتی ہیں گھٹائیں ہر بار	کہتی ہیں توبہ زاہد سے کہ اب کی تو سنبھل

کچھ عجب شان سے تنتے ہیں جوانانِ چمن	صحنِ گلزار ہے یا عیش و طرب کا دنگل

جھومتی چلتی ہے بیخود روشوں پر جو نسیم	غنچے کہتے ہیں چٹک کر کہ سنبھل دیکھ سنبھل

اے صبا باغ میں آنا تو دبے پاؤں ذرا	نیند میں سبزۂ خوابیدہ کے آئے نہ خلل

بوئے خوش سے یہ نسیم سحری کہتی ہے	حجرۂ غنچہ میں کیا کرتی ہے آ سیر کو چل

اوجِ اقبال تو دیکھو کہ سلیماں کی طرح	سیر کرتے ہوئے پھرتے ہیں ہوا پر بادل

مژدہ اے بادہ کشو اب تمھیں ڈر کس کا ہے	ابر کا عالمِ بالا پہ بھی ہے اب تو عمل

اس کے بعد سید محمود کی تعریفیں ہیں، اور آخر میں مقطع ہے،

میں بھی ہوں عنصریِ وقت جو محمود ہے تو	میں بھی ہوں نازِ سلف تو ہے اگر فخرِ اُوَل

مولانا کا یہ اردو قصیدہ بہت پرزور اور پرشکوہ ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کہتے وقت شاعر کی نگاہ میں دو قصیدے تھے، ایک انشا کا وہ قصیدہ

کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے جوانانِ چمن

اور دوسرا محسن کاکوروی کا یہ قصیدہ ع

سمت کاشی سے چلا جانبِ بطحا بادل

مقطع کا فخر یہ بھی لاجواب ہے ،

تیسرا دور | مولانا کی اردو شاعری کا تیسرا دور حیدرآباد کے قیام کا ہے، جو صرف چار برس رہا، ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۴ء تک اس زمانہ میں حیدرآباد کے شعر و شاعری کی زمین حضرت داغ کے وجود سے بڑی رنگین تھی، داغ سے وہ ملتے بھی تھے اور ان کی شاعری کے وہ بڑے مداح تھے، ان کے بہت سے اچھے شعر مولنا کو یاد تھے، اسی لئے حیدرآباد میں ایک فارسی قصیدہ شروع کیا تھا، اس میں کہا ہے

ہاں تو دعوی کن و ما نیز مسلّم داریم

شبلیِ سحر فن و داغِ غزل خواں از تست

حیدرآباد میں مشاعرے ہوتے تھے، مجلسیں جمتی تھیں، غزلیں پڑھی جاتی تھیں، مگر افسوس ہے کہ سوائے ایک غزل کے اس زمانہ کی کوئی چیز ہاتھ نہیں آئی

اثر کے پیچھے دلِ حزیں نے سراغ چھوڑا نہیں کہیں کا

گئے ہیں نالے جو سوئے گردوں تو اشک نے رخ کیا زمیں کا

وہی لڑکپن کی شوخیاں ہیں وہ اگلی ہی سی شرارتیں ہیں

سیانے ہونگے تو ہاں بھی ہوگی ابھی تو سن ہے نہیں نہیں کا

یہ نظم آئیں یہ طرز بندش سخنوری کیا فسوں گری ہے

کہ ریختہ میں بھی تیرے شبلی مزہ ہے طرزِ علی حزیں کا

چوتھا دور | یہ دور ۱۹۰۸ء سے شروع ہو کر ۱۹۱۴ء تک یعنی ان کی وفات تک قائم رہا، اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی اردو شاعری کا یہی دوران کی اردو شاعری کا امتیازی دور ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب اسلامی دنیا میں انقلاب برپا تھا مسلم لیگ کا ہنگامہ، مسلم یونیورسٹی کا قیام اور اس کے بعض حقوق کیلئے گورنمنٹ اور مسلمانوں کے درمیان شدید اختلاف، کانپور کی مسجد کا خونین منظر، بنگال کی تنسیخ، طرابلس کی لڑائی، بلقان کی جنگ، ندوہ کے طلبہ کی وہ اسٹرایک جس نے پورے ہندوستان میں شورش پھیلادی تھی، اور آخر میں دنیا کی بڑی لڑائی،

اس وقت مسلمانوں میں یورپ کی طرف سے عموماً اور برطانیہ کی طرف سے خاص طور سے مسلمانوں کے دل جلے ہوے تھے، سرسید کی پرانی پالیسی کا عہد ٹوٹ کر مسلمان علانیہ بغاوت کا اظہار کر رہے تھے، بنگال کی تقسیم جو "طے شدہ امر" کہا جا رہا تھا اسکی تنسیخ نے ایک قیامت سی برپا کر رکھی تھی اور اس کا مجموعی اثر یہ تھا کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی طبیعتوں میں سخت اشتعال تھا، اس پر آشوب زمانہ کا شاعر اگر کوئی ہے تو وہ مولنا شبلی تھے، ہر ہفتہ جو واقعہ پیش آتا تھا اس پر وہ ایک ایسا شاعرانہ اظہار خیال کرتے تھے کہ اس زمانہ کے بچہ بچہ کی زبان پر وہ اشعار چڑھ جاتے تھے، ان نظموں میں جوشِ بیان، قوتِ نظم اور مؤثر طنز کا ایسا تیز نشتر چھپا تھا کہ وہ جس پر پڑتا تھا تلملا جاتا تھا، مولانا کی اسی شاعری کے نمونے ہیں، جن کو اردو شاعری کی ایک نئی چیز کہنا چاہئے، اس زمانہ میں لاہور میں زمیندار، دلی میں ہمدرد، لکھنؤ میں مسلم گزٹ اور کلکتہ میں الہلال نکل رہا تھا، یہ چاروں اخبار آگے بڑھنے والے مسلمانوں کی جنکو "احرار" کہا جاتا تھا زبانِ حال تھے، انہی میں مولانا کی نظمیں چھپتی تھیں، اور خاص طور

سے الہلال کلکتہ میں جو مولانا ابوالکلام کا ہفتہ وار اخبار تھا، مولانا ابوالکلام اور مولانا شبلی میں اس زمانہ میں بجد علمی و عملی تعلقات اور سیاسی اتحاد خیال تھا اور اسی لئے الہلال ان کی نظموں کی اشاعت کا خاص ذریعہ بن گیا تھا،

یہ نظمیں مولانا شبلی کے نام کے بجائے پہلے کشاف کے نام سے چھپیں، ایک ہی دو نظمیں چھپی تھیں کہ لوگوں کی نظریں اٹھ گئیں اور شاعر کی تلاش شروع ہو گئی اور آخر بعض بعض پر اس کی شخصیت کا بھید کھل گیا، تو کشاف نے وصاف کا بھیس بدلا، مگر اس بھیس میں بھی شخصیت پر پردہ نہ پڑ سکا، اور یہ راز سب پر کھل گیا، تب مولانا نے اپنے نام سے نظمیں لکھنی شروع کیں،

مسلمانوں کی سیاسی نظموں میں سے سب سے پہلے قابلِ ذکر وہ نظم ہے جو شہر آشوب اسلام کے نام سے جنگِ بلقان کے زمانہ میں لکھی، یہ نظم رفاہِ عام لکھنؤ کے جلسہ میں پڑھی گئی تھی اور جب پڑھی گئی تھی تو اس کا یہ اثر تھا کہ صدر سے لیکر پائیں تک ماتم برپا ہو گیا تھا،

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک ... چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیئے پرزے ... فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک
مراکش جا چکا، فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے ... کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ خستہ جاں کب تک

خواجہ کمال الدین صاحب لاہور نے ایک خط میں مولانا کو لکھا تھا کہ اس نظم نے مجھ کو لندن میں تڑپا دیا، اور اسلامک ریویو کے نکالنے کے محرکات میں سے ایک نظم بھی تھی، اس نظم کا اتنا چرچا ہوا کہ کئی صاحبوں نے اس زمین میں طبع آزمائی کی، اس کے آخر کے چند شعر بالکل الہامی ہیں،

زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع وملت ہے — عزیزو فکرِ فرزند و عیال و خانماں کبتک

پرستارانِ خاکِ کعبہ دنیا سے اگر اٹھے — تو پھر یہ احترامِ سجدہ گاہِ قدسیاں کبتک

جو گونج اٹھیگا عالم شورِ ناقوسِ کلیسا سے — تو پھر یہ نغمۂ توحید و گلبانگِ اذاں کبتک

کہیں اڑکر نہ دامانِ حرم کو بھی نہ چھو آئے — غبارِ کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کبتک

حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں — تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کے آشیاں کبتک

جو ہجرت کرکے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں — کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کبتک

بلقان کی لڑائی میں ڈاکٹر انصاری کا طبی وفد ہندوستان سے گیا تھا، وہ جب واپس آیا تو مولانا بمبئی میں تھے، وہیں خیر مقدم لکھا اور وہیں جلسہ میں پڑھا گیا، اس نظم میں دو بند ہیں، دوسرا بند قیامت کا ہے، ناممکن ہے کہ آج بھی وہ پڑھا جائے اور سننے والے کا دل اثر سے بھر نہ جائے،

مسلمانوں کے تم نے طالعِ واژوں بھی دیکھے ہیں — نئے سب انقلابِ گردشِ گردوں بھی دیکھے ہیں

تمہارا دردِ دل سمجھینگے کیا ہندوستان والے — کہ تم نے وہ مظالم ہائے روزافزوں بھی دیکھے ہیں

یتیموں کے سنے ہیں نالہ ہائے جانگزا تم نے — زنانِ بیوہ کے چہرۂ محزوں بھی دیکھے ہیں

گھروں کے لوٹنے کے بعد زندوں کو جلا دینا — بلادِ مغربی کے یہ نئے قانوں بھی دیکھے ہیں

مسلمانوں کا قتلِ عام اور ترکوں کی بربادی — نتائج ہائے امیدِ گلیڈسٹوں بھی دیکھے ہیں

تمہیں نے غازیوں کے زخم پر ٹانکے لگائے ہیں — شہیدانِ وطن کے جامۂ پرخوں بھی دیکھے ہیں

لہو کی چادریں دیکھی ہیں رخسارِ شہیداں پر — زمیں پر پارہ ہائے سینۂ پرخوں بھی دیکھے ہیں

نگاہ آرائیاں دیکھی ہیں چشمِ گوہر افشاں کی — شہیدانِ وفا کے عارضِ گلگوں بھی دیکھے ہیں

تمہیں سے کچھ پتہ ملتا ہے شیدایانِ ملت کا — کہ تم نے شاہدِ اسلام کے مفتوں بھی دیکھے ہیں

جنونِ جوشِ اسلامی کوئی سمجھا تو تم سمجھے — کہ تم نے لیلیِ اسلام کے مفتوں بھی دیکھے ہیں

اخیر کے تین ایسے شعر ہیں جنکو پیشینگوئیوں میں شمار کیا جاسکتا ہے،

سہارا ہی اگر امید کا اب بھی کوئی باقی — تو تم نے وہ رموزِ قوتِ مکنوں بھی دیکھے ہیں

عجب کیا ہی یہ بیڑا غرق ہوکر پھر ابھر آئے — کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

مچھلی دالاں کانپور کی مسجد کے انہدام پر سارے ہندوستان میں کہرام مچ گیا تھا، اس سانحہ پر مولانا نے خوب خوب نظمیں لکھیں، جو مدت تک سب کی زبانوں پر تھیں، مولانا اس وقت بمبئی میں تھے، ان کی پہلی نظم یہ نکلی،

پہنائی جارہی ہیں عالمانِ دیں کو زنجیریں — یہ زیور سید سجاد عالی کی وراثت ہے

یہی دن ہیں اگر ہیں کشتگانِ خنجر اندازی — تو مجھکو سستیِ بازوئے قاتل کی شکایت ہے

عجب کیا ہی جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں — کہ بچے ہیں سویرے انکو سو جانے کی عادت ہے

شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں — کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محرومِ سعادت ہے

کانپور کے سلسلہ کی سب سے مؤثر نظم کے چند شعر یہ ہیں، آپ کو معلوم ہوگا کہ ہر شعر کس طرح تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے

کل مجھ کو چند لاشۂ بیجاں نظر پڑے — دیکھا قریب جاکے تو زخموں سے چور ہیں

کچھ طفلِ خوردسال ہیں جو چپ ہیں خود مگر — بچپن یہ کہہ رہا ہی کہ ہم بے قصور ہیں

آئے تھے اس لئے کہ بنائیں خدا کا گھر — نیند آگئی ہے منتظرِ نفخِ صور ہیں

کچھ نوجواں ہیں بیخبرِ نشۂ شباب — ظاہر میں گرچہ صاحبِ عقل و شعور ہیں

اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ — مجرم کوئی نہیں ہی مگر ہم ضرور ہیں

سینہ پہ ہم نے روک لئے برچھیوں کے وار — از بسکہ مستِ بادۂ ناز و غرور ہیں

کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا   جو خاک و خوں میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں

بلقان وطرابلس کے خونیں معرکوں کی تصویریں بھی اسی خوبی سے مولانا کے شاعرانہ مرقع میں موجود ہیں،

مسلم لیگ جس نے ۱۹۱۲ء میں سوٹ ایبل گورنمنٹ کا نقاب اپنے چہرہ پر ڈال لیا تھا، مولانا نے اس کی خوب خوب دھجیاں اڑائی ہیں، مگر افسوس ہے کہ اس وقت ان کی شاعری کے اس حصہ سے پردہ اٹھانے کا موقع نہیں، ورنہ ستیا گرہ کا ڈر ہے، صرف ایک نظم پر اکتفا کی جاتی ہے، جس میں اس بات کا بیان ہے کہ سرسید کی وفادارانہ پالیسی ان کی طبیعت کی اصلی آمد نہ تھی، بلکہ کالج اسٹاف کے انگریز ممبروں کی سکھائی ہوئی تھی، فرماتے ہیں،

کوئی پوچھے تو کہہ دونگا ہزاروں میں یہ بات   روشِ سیدِ مرحوم خوشامد تو نہ تھی
ہاں مگر یہ ہے کہ تحریکِ سیاسی کے خلاف   ان کی جو بات تھی آورد تھی آمد تو نہ تھی

مسلم یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی نے مسلمانوں کے عام مطالبہ کے برخلاف جس میں علی گڈھ یونیورسٹی کے بجائے مسلم یونیورسٹی نام رکھے جانے، تمام ہندوستان کے اسلامی اسکولوں اور کالجوں کے الحاق کے حق اور ویسرائے کے اختیارات کم کیے جانے کے مطالبے بہت سخت تھے جو کچھ کیا مولانا نے اس پر نہایت ہی پرزور نظمیں لکھی ہیں، جن کے ایک ایک دو دو شعر بھی سنائے جائیں تو ہمارے قریب کے احباب ہم کو اجازت نہیں دے سکتے، ان سیاسی نظموں میں سب سے بڑی خوبی

نظم کی متانت، الفاظ کا دروبست، ترکیبوں کی چستی اور ان کا طنزیہ طرز بیان ہے، ہر شعر مخالف پر تیر و نشتر کا اثر رکھتا ہے اور پھر گرفت کی کوئی چیز نہیں،

کامیابی میں بس اک آدھ برس باقی ہے ۔۔۔ لیگ سے سلسلۂ کانگرس باقی ہے

اب بھی آجاتی ہی کالج سے خوشامد کی صدا ۔۔۔ جاچکا قافلہ اب بانگ جرس باقی ہے

اس دور میں سیاسی نظموں کے علاوہ مولانا نے تاریخی اور اخلاقی نظموں کے دو الگ سلسلے شروع کئے، جن میں سے ہر ایک اپنی خوبی اور بلندی کے لحاظ سے اردو کے بڑے بڑے ضخیم دیوانوں کے مقابلہ میں بھاری ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اردو ادب میں ان کی کوئی مثال نہیں، ورنہ اب تک ان کی تقلید کی جا سکی، ان نظموں نے ایک طرف اسلامی تاریخ کے انمول موتیوں کو ایک دھاگے میں پرو کر قومی اخلاق کے حسن کو دوبالا کیا، دوسری طرف ہماری زبان کی شاعری میں صحیح واقعات کو نظم کرنے کے بہترین نمونے پیش کئے، اکثر کہا گیا ہے کہ بہترین شاعری وہ ہے جس میں جھوٹ یعنی مبالغہ اور خیال آرائی کا حصہ زیادہ ہو، مگر مولانا کی ان نظموں نے یہ دکھا دیا کہ واقعیت کی سطح پر بھی شاعری کا کمال دکھایا جا سکتا ہے، عموماً ان نظموں میں روایت کے الفاظ کا ٹھیٹ ترجمہ کر دیا گیا ہے، پھر بھی کمال یہ ہے کہ خوبی ادا اور تعبیر میں شاعری کا پورا زور ہے،

افلاس سے تھا سیدۂ پاکؓ کا یہ حال ۔۔۔ گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا

گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں ۔۔۔ چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا

سینہ پہ مشک بھر کے جو لاتی تھیں بار بار ۔۔۔ گو نور سے بھرا تھا مگر نیل فام تھا

اٹ جاتا تھا لباسِ مبارک غبار سے ۔۔۔ جھاڑو کا مشغلہ بھی جو ہر صبح و شام تھا

آخر گئیں جناب رسول خدا کے پاس
یہ بھی کچھ اتفاق کہ واں اذن عام تھا
محرم نہ تھے جو لوگ تو کچھ کر سکیں نہ عرض
واپس گئیں کہ پاس حیا کا مقام تھا
پھر جب گئیں دوبارہ تو پوچھا حضورؐ نے
کل کس لئے تم آئی تھیں کیا خاص کام تھا
غیرت یہ تھی کہ اب بھی نہ کچھ منھ سے کہہ سکیں
حیدرؓ نے اُنکے منھ سے کہا جو پیام تھا
ارشاد یہ ہوا کہ غریبانِ بے وطن
جن کا کہ صفۂ نبوی میں قیام تھا
میں ان کے بندوبست سے فارغ نہیں ہنوز
ہر چند اس میں خاص مجھے اہتمام تھا
جو جو مصیبتیں کہ اب اُن پر گذرتی ہیں
میں ان کا ذمّہ وار ہوں میرا یہ کام تھا
کچھ تم سے بھی زیادہ مقدم ہے ان کا حق
جنکو کہ بھوک پیاس سے سونا حرام تھا
خاموش ہو کے سیدۂ پاک رہ گئیں
جرأت نہ کر سکیں کہ ادب کا مقام تھا

یوں کی ہے اہلِ بیتِ مطہر نے زندگی
یہ ماجرائے دخترِ خیر الانام تھا

ان نظموں میں اسلامی روایتوں سے ایسے پرتاثیر واقعے موزوں کئے گئے ہیں جو اسلامی تاریخ کے پرفخر کارنامے ہیں،

سنہ ۱۹۱۲ء میں ندوۃ العلما اور اس کے دارالعلوم کا جو اصلاحی ہنگامہ سارے ملک میں برپا ہوا تھا، گو لوگ اس کو بھول چکے ہیں مگر مولانا کی وہ چند نظمیں جب تک باقی ہیں، جنیں ادھر اشارہ کیا گیا ہے وہ بھولا یا نہیں جاسکتا۔

مولانا کی طبیعت بہت ہی حساس تھی، اس لئے وہ فوری واقعات سے بہت جلد متاثر ہوتے تھے، اور یہی تاثیر ان کی شاعری کی روح تھی، یہی سبب ہے کہ مولانا نے اپنے زمانہ کے اکثر ناموروں کی وفات پر مرثیے لکھے، اور بڑے پردرد لکھے، مگر یہ سب

مرثیے فارسی میں لکھے گئے ہیں، لیکن اپنی زندگی کا سب سے آخری سانحہ یعنی (اپنے بھائی مولوی محمد اسحاق وکیل ہائیکورٹ الٰہ آباد کی وفات پر جو دلدوز نوحہ لکھا ہے، وہ اردو ہی میں لکھا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک اردو مرثیہ، ہماری زبان کے بہترین مرثیوں کے لئے ایک عمدہ نمونہ ہے، مرثیہ کیا ہے، درد کی پوری تصویر ہے،

وہ برادر کہ مرا یوسفِ کنعانی تھا　　وہ کہ مجموعۂ ہر خوبیِ انسانی تھا

وہ کہ گھر بھر کیلئے رحمتِ یزدانی تھا　　قوتِ دست و دلِ شبلیِ نعمانی تھا

جوش اسی کا تھا جو میرے سرِ پُرشور میں تھا

بل اسی کا یہ مرے خامۂ پُرزور میں تھا

اسی طرح اس مسدس کا ہر بند نالہ اور فریاد ہے،

فوری واقعات پر ان کے دو دو تین تین شعر کے قطعے اردو ادب میں پہلی چیز ہیں جیسے

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی　　مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا

مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم　　خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

پیغمبرِ خاتم اور خاتمہ بالخیر کی مناسبت چھپی نہیں، مگر اس میں جو بات چھپی ہے وہ یہ کہ ان کی یہ شاعری کتنی الہامی تھی کہ شاعرانہ پیشینگوئی تاریخ کا واقعہ ہو کر رہی[1]،

سید سلیمان ندوی

دار المصنفین اعظمگڈھ

۶، اپریل سنہ ۱۹۴۰ء

[1] اس مضمون کا خلاصہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا تھا،

فہرست مضامین

کلیات شبلی اردو

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
مثنوی صبح امید ،	۱-۲۰	تعمیر مسجد نبوی صلعم ،	۳۴
تماشاے عبرت ، یعنی قومی مسدس	۲۱	رسول اللہ صلعم کا حلم اور عفو ،	۳۶
قصیدہ اُردو ،	۲۵	اہلبیت کی زندگی ،	۳۷
قصیدہ ،	۲۸	ایثار کی اعلیٰ ترین نظیر ،	۳۸
قصیدہ مدح سلطان عبدالحمید خان	۳۰	مساوات اسلام ،	۳۹
قصیدہ تہنیت شادی جسٹس سید محمود مرحوم ،	۳۱	عدل فاروقی کا ایک واقعہ ،	۴۰
		عدل فاروقی کا ایک نمونہ ،	۴۲
چند مذہبی اور اخلاقی نظمیں	**۳۳ - ۵۵**	اظہار و قبول حق ،	۴۳
		جرأت صداقت ،	۴۴
		نظام حکومت اسلام ،	۴۵
ہجرت نبوی صلعم ،	۳۳	ہمارا طرز حکومت ،	۴۶

مضمون	صفحہ
عدل جہانگیری،	۴۷
اسلام کے تنزل کا اصلی سبب،	۴۹
خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا انصاف،	۵۰
شغل تکفیر،	۵۱
مذہب یا سیاست،	۵۲
خواتینِ عرب کا ثبات و استقلال	۵۴
سیاسی نظمیں	۵۶ - ۱۰۶
شہر آشوب اسلام،	۵۶
خیر مقدم ڈاکٹر انصاری،	۵۸
سر آغا خاں کا خطاب ترکوں سے	۶۰
ترکوں سے خطاب،	۶۲
ہستیِ مسلم کی رہائی،	″
بمبئی کی وفادار انجمن،	۶۳
مسلم لیگ،	۶۴
مسلم لیگ،	۶۶
لیگ کی دائم المرضی کی علتِ اصلی	۶۷
"لیگ مع سوٹ اپیل"	۶۸
سوٹ اپیل سلف گورنمنٹ،	۶۹
مسلم لیگ،	۷۰
خطاب بہ رائٹ آنریبل سیّد امیر علی،	۷۱
مسلم لیگ،	۷۳
خطاب بہ احرار،	۷۴
جزر و مد،	۷۵
احرار قوم اور طفل سیاست،	۷۶
کفرانِ نعمت،	۷۷
ہنگامۂ مسجد کانپور،	۷۹
ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں	۸۰
علمائے زندانی،	۸۱
آپ ظالم نہیں زنہار یہ ہم ہیں مظلوم	۸۲
کانپور میونسپلٹی کا خطاب مسجد مچھلی بازار کانپور سے،	۸۲
شرائط صلح،	۸۳
خون کے چند قطرے،	۸۴

مضمون	صفحہ
دنیا میں مسلمانوں کی تعداد کیوں نہیں بڑھتی،	۸۴
تقسیم عمل،	۸۵
پا بہ زنجیرانِ کانپور،	״
وضو خانہ،	״
تفریق و تجزی	۸۶
وحدت و کثرت،	״
مسجد کانپور کا وفد اور مسٹر جیمس مسٹن کا جواب،	״
شیر برطانیہ اور گربۂ حریت،	۸۷
خطاب بحضور ویسرائے،	״
مسلم یونیورسٹی،	۸۸
یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی کا اجلاس لکھنؤ،	۹۱
عرض نیاز بہ جناب مالک الملک	۹۳
تقسیم عمل،	۹۴
مسئلہ الحاق،	۹۶
یونیورسٹی اور الحاق،	״
یونیورسٹی ڈیپوٹیشن،	۹۷
یونیورسٹی ڈیپوٹیشن،	۹۸
مسلم یونیورسٹی کا نصاب تعلیم	״
ندوۃ العلماء،	۱۰۰
جنگ زرگری،	۱۰۱
ندوۃ العلماء اور ننگ معاینۂ اغیار،	۱۰۲
تفرقہ حق و باطل،	۱۰۴
مسلم کی وفاداری،	۱۰۵
جنگ یورپ اور ہندوستانی	۱۰۶
شذرات نظم (متعلق سیاسیات)	۱۰۷ - ۱۱۲
آئندہ مسلم لیگ کی صدارت،	۱۰۷
درس پیشوائی کی ابجد،	۱۰۸
افسونِ حریت،	״
حرکتِ اضطراری،	״
رسی کا بل،	۱۰۹

مضمون	صفحہ

مضمون	صفحہ
سوٹ اپیل گورنمنٹ،	۱۰۹
سرسیّد کی سیاسی بلاغت،	〃
ردّ عمل،	۱۱۰
ناصحانِ مشفق کو دیوانگانِ حریّت کا جواب،	〃
قال کے بجائے حال درکار ہے،	۱۱۱

مرثیہ

۱۱۲ - ۱۱۵

مضمون	صفحہ
بربادیِ خانمانِ شبلی،	۱۱۲

متفرقات

۱۱۶ - ۱۱۸

مضمون	صفحہ
سیرۃ نبویؐ،	۱۱۶
سیرۃ نبویؐ اور ہر ہائنس سرکارِ بھوپال،	۱۱۷
سانحہ گزند پا،	〃
طلبائے ندوہ سے خطاب،	۱۱۸

ناتمام نظمیں

۱۱۹ - ۱۲۰

مضمون	صفحہ
نالۂ شبلی،	۱۱۹
دیگر،	〃
ترکوں کے فتوحات،	۱۲۰

مطائبات

۱۲۰ - ۱۲۱

مضمون	صفحہ
حضرت اکبر الہ آبادی کے رقعۂ دعوت کا جواب	۱۲۰
عطیہ بیگم کی شادی،	۱۲۱

۷۸۶

صبحِ اُمید

ادراکِ حالِ ما ز نگہ می تواں نمود
حرفے ز حالِ خویش بہ سیما نوشتہ ایم

کیا یاد نہیں ہیں وہ ایام؟ — جب قوم تھی مبتلائے آلام
وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی — جو تاج تھی فرقِ آسماں کی
تھے جس پہ نثار فتح و اقبال — کسریٰ کو جو کر چکی تھی پامال
گُل کر دیئے تھے چراغ جس نے — قیصر کو دیے تھے داغ جس نے
وہ نیزۂ خوں فشاں کہ چلکر — ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر
رُوما کے دھویں اڑا دیئے تھے — اِٹلی کو کنوئیں جھکا دیے تھے
با ایں ہمہ جاہ و شوکت و فر — اقلیمِ ہنر بھی تھے مُسخّر
ہیئت میں بلند پایہ اس کا — تھا فلسفہ زیرِ سایہ اُس کا
منطق میں ہوا جو گرم جولاں — تھامے تھے رکاب مصر و یوناں
میدانِ سخن جو رو برو تھا — فارس کی زباں پہ طرِقُوا تھا

جو فلسفیانِ ہند و چیں تھے
خرمن سے اسی کے خوشہ چیں تھے

یہ قوم کہ تاجِ آسماں تھی
اب کوئی گھڑی کی میہماں تھی

تھے جان کے پڑ گئے جو لالے
ہر سانس پہ لیتی تھی سنبھالے

جس چشمے سے اک جہاں تھا سیراب
وہ سوکھ کے ہو رہا تھا بے آب

پامال ہوا تھا بوستاں کیا!
آئی تھی بہار پر خزاں کیا!

وہ ابر کہ چھا رہا تھا یکسر
دو دن ہوئے کھُل گیا برس کر

پستی نے دبا لیا فلک کو،
خورشید ترس گیا چمک کو

اب خضر کو گمرہی کا ڈر ہے
عیسیٰ کو تلاشِ چارہ گر ہے

جو ابر ابھی برس گیا ہے
اک بوند کو اب ترس گیا ہے

اسلام کی جان پر بنی ہے
دم توڑ رہا ہے جاں کنی ہے

ہرچند یہ ہو چکی تھی حالت
ہم تھے وہی مستِ خوابِ راحت

غفلت نے ڈبو دیا تھا ہم کو
تقلید نے کھو دیا تھا ہم کو

مٹنے پہ جو تھا نشاں ہمارا
خواب اور ہوا گراں ہمارا

غفلت کے یہ چل رہے تھے جھونکے
گو صبح ہوئی پہ ہم نہ چونکے

کس نیند میں سو گئی تھیں آنکھیں؟
بے کار سی ہو گئی تھیں آنکھیں

ادراک و خرد سے برطرف تھا
دل یا کوئی پارۂ خزف تھا؟

بے کار تھا، بے نظام تھا دل
پہلو میں برائے نام تھا دل

تھے ہوش و حواس سب معطل
سیدھی تھی غرض نہ ایک بھی کل

تھی روز بروز حالت ابتر
بن بن کے بگڑ چلا مقدر

پیچھے ہٹنے لگی تھی بڑھ کر
دریا یہ اُتر چلا تھا چڑھ کر

عزت نہ رہی نہ جاہ و ثروت
افلاس کی بج چکی تھی نوبت

دولت سے جو ہاتھ دھو چکے تھے
ہم علم و ہنر بھی کھو چکے تھے

وہ فلسفۂ کہن ہمارا
گنجینۂ علم و فن ہمارا

وہ اوجِ کمالِ نکتہ دانی
یعنی وہ مسائلِ معانی

منقول کی انتہائے تکمیل
آئین و اصولِ جرح و تعدیل

ترتیبِ گذارشِ دلائل
اس طرح کے اور بھی مسائل

اندوختۂ سلف تھا جو کچھ
وہ لعل تھا یا خزف تھا جو کچھ

تھے ذرۂ خاک۔ یا ستارے
اب کچھ نہیں ہاتھ میں ہمارے

معقول کو۔ فقہ کو۔ ادب کو
ہم ہاتھ سے کھو چکے ہیں سب کو

بیہودہ فسانہائے پارین
زلف و خط و خال کے مضامین

وہ نوکِ مژہ کی نیزہ بازی
وہ تُرکِ نگہ کی فتنہ سازی

یہ طرزِ خیال تھا ہمارا
یہ فن۔ یہ کمال تھا ہمارا

جغرافیۂ وجود سارا
ہر چند کہ ہم نے چھان مارا

کی سیر بھی گرچہ بحر و بر کی
لیکن نہ خبر ملی کمر کی

نالوں کے دکھائے جب تماشے
گردوں کے اڑا دیے پرخچے

دریا ٹھیرا یا چشمِ تر کو
خوں نابہ فشاں کہا جگر کو

چھیڑا رگِ دل کو نیشتر سے
نالوں کو لڑا دیا اثر سے

اس کوچۂ تنگ و تار سے ہم
اس پیچ سے اس حصار سے ہم

کھایا کئے گو ہزار چکر
تا زیست نکل سکے نہ باہر

چرچا یا ذکر تھا تو یہ تھا
جولاں گہِ فکر تھا، تو یہ تھا

اپنی تو ہمیں نہ کچھ خبر تھی
اوروں کے عیوب پر نظر تھی

لڑتے پڑتے تھے بات بات میں ہم
ڈوبے تھے تعصبات میں ہم

دکھلائی کمال دینداری
مومن کو بنا دیا جو ناری

تکفیر، ہمارا ہی چلن تھا
زندیق۔ تو تکیۂ سخن تھا

دشمن کو نہ کر سکے موافق
مومن کو بنا دیا منافق

گمراہ تو سیکڑوں بنائے
رستے پہ نہ ایک کو بھی لائے

خلقِ نبوی کی تھی یہ تصویر!
آپس میں ہر ایک گرمِ تکفیر

تصنیف میں گالیوں کی بھرمار
تحریر کہ لعنتوں کا انبار

برپا تھے وہ مسجدوں میں فتنے
دیکھے نہ سنے کبھی کسی نے

آپس میں نفاق کا یہ عالم
یہ اُس سے خفا۔ وہ اُس سے برہم

اللہ رے یہ وفورِ غفلت!
سمجھے تھے رواج کو شریعت!

باطل پہ فدا۔ تو حق سے بیزار!
تقلید پہ کس بلا کا اصرار!

دیندار برائے نام تھے ہم
وابستۂ رسمِ عام تھے ہم

تھے رسم و رواج پر فدا سب
تحقیق سے کچھ غرض نہ مطلب

سمجھے نہ ذرا۔ کہ وقت کیا ہے؟
کس سمت زمانہ چل رہا ہے؟

نیرنگیوں پر نہ کچھ نظر کی
یعنی کہ ہوا ہے اب کدھر کی؟

کیا پیش ہے؟ کیسی صورتیں ہیں؟
کیا وقت ہے؟ کیا ضرورتیں ہیں؟

رنگ و روشِ سپہر کیا ہی؟ — اب طرزِ خرامِ دہر کیا ہے؟

ہیں چرخ کی اب نئی ادائیں — چلنے لگیں اور ہی ہوائیں

چھیڑے جو گئے نئے فسانے — نغمہ وہ رہا، نہ وہ ترانے

پھونکا ہے فلک نے اور افسوں — اب رنگِ زمانہ ہے دگرگوں

سیّارے ہیں اب نئی چمک کے — وہ ٹھاٹھ بدل گئے فلک کے

اب صورتِ ملک و دیں نئی ہے — افلاک نئے، زمیں نئی ہے،

سب بھول گئے ہیں ماسبق کو — گردوں نے الٹ دیا ورق کو

تیور جو بدل گئے قضا کے — ڈھنگ اور ہیں چرخِ فتنہ زا کے

میخانۂ اوّلیں ہمارا — وہ جام۔ وہ ساتگیں ہمارا

وہ لطف سکے تذکرے وہ فرصت — وہ گرمیِ انجمن۔ وہ صحبت

وہ سحر و فسوں گری زباں کی — وہ طرز۔ وہ شوخیاں بیاں کی

وہ دُرجِ دُرِ سخن ہمارا — گنجینۂ علم و فن ہمارا

جو زینت و ساز تھے ہمارے — جو مایۂ ناز تھے ہمارے

جس باغ کے برگ و ساز تھے ہم — یعنی کہ چمن طراز تھے ہم

جو دشت تھا سبزہ زار ہم سے — جس باغ پہ تھی بہار ہم سے

جس بزم کے میگسار تھے ہم — جس ملک کے تاجدار تھے ہم

جھونکے جو چلے نئی ہوا کے — آغوش میں آگیا فنا کے

وہ بزم رہی۔ نہ جام و ساغر — یک بار الٹ گیا وہ دفتر

دیکھی یہ روش تو پھر خردمند — ہوتے گئے طرزِ نو کے پابند

گرنے بھی نہ پائے تھے کہ سنبھلے
بدلا جو زمانہ۔ وہ بھی بدلے

طرز و روشِ زمانہ حال
جس ڈھنگ پہ ہے چلے وہی چال

یاں اور جو قافلے رواں ہیں
سب بادِ صبا سے ہم عناں ہیں

لیکن نقشِ زمیں رہے ہیں ہم
بیٹھے تھے جہاں۔ وہیں رہے ہم

گر کر نہ کبھی ابھر سکے ہم
بگڑے، تو نہ پھر سنور سکے ہم

گو غیر اب اہلِ انجمن ہیں
ہم گرمِ فسانۂ کہن ہیں

اب تک ہیں بغفلت آرمیدہ
محوِ چمنِ خزاں رسیدہ

ہر چند وہ بزم ہے، نہ احباب
ہم دیکھ رہے ہیں پر وہی خواب

گو لطمہ خورِ زمانہ ہیں ہم
مخمورِ مئے شبانہ ہیں ہم

اس گنجِ گہر پہ ہم ہیں نازاں
جس کا کوئی جوہری نہیں یاں

قائم جو وہ انجمن نہیں ہے
اس نقد کا اب چلن نہیں ہے

اب عیب ہیں سب ہنر ہمارے
ہیں پوچھتے کم گہر ہمارے

از بسکہ ذلیل و خوار ہیں ہم
افسانۂ روزگار ہیں ہم

ہے اوج پہ بختِ بد ہمارا
دیکھے کوئی جزر و مد ہمارا

کیا کوئی سنے فغاں ہماری!
دلدوز ہے داستاں ہماری

ہم مایۂ عبرتِ جہاں ہیں!
ہم ننگِ زمین و آسماں ہیں!

ناچار ہیں، خستہ حال ہیں ہم
عبرت کدۂ زوال ہیں ہم

مٹنے پہ ہے اب نشاں ہمارا
گم گشتہ ہے کارواں ہمارا

کس نہ دانست کہ منزل گہِ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید

ماتم تھا یہی۔ کہ آئی ناگاہ — اک سمت سے اک صدائے جانکاہ
اس شان سے تھی وہ آہِ دلگیر — پہلو میں اثر۔ بغل میں تاثیر
دل ہاتھ سے لینے میں بلا تھی — جادو تھی؟ فسوں تھی؟ جانے کیا تھی؟
ڈوبی ہمہ تن جو تھی اثر میں — نشتر سی اتر گئی جگر میں
جس سمت سے آئی تھی وہ آواز — وہ جلوہ نمائے سحر و اعجاز
جنبش جو ہوئی رگِ اثر کو — دل تھام کے سب بڑھے اُدھر کو
دیکھا تو وہاں بجاہ و تمکیں — آیا نظر اک پیرِ دیرین
صورت سے عیاں جلالِ شاہی — چہرے پہ فروغِ صبح گاہی
وہ ریشِ دراز کی سپیدی — چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں اک ذرا خم — توقیر کی صورتِ مجسّم
وہ ملک پہ جان دینے والا — وہ قوم کی ناؤ کھینے والا
اٹھتے ہوئے جوش سے برقّت — ہے مرثیہ خوانِ قوم و ملّت
نالاں ہیں کہ "اب سے بھی تو جاگو! — اے خوابِ گراں کے سونے والو!
آخر کب تک یہ خوابِ غفلت؟ — اٹھو تو ذرا نقابِ غفلت؟
تاچند رہوگے مست و سرشار؟ — اُٹھو! کہ سحر ہوئی نمودار؟
سوچو تو ذرا! کہ حال کیا ہے؟ — کس خواب میں ہو؟ خیال کیا ہے؟
غفلت میں جو شب بسر ہوئی ہے — لو اب تو اٹھو! سحر ہوئی ہے؟
کچھ تم کو خبر ہے، یا نہیں ہے؟ — کچھ دل پہ اثر ہے، یا نہیں ہے؟
اغیار کے طنز کو بھی سُنکر — لگتے نہیں کیا جگر پہ نشتر؟

دیکھو تو ذرا یہ حالتِ زار — کیوں قیدِ بلا میں ہو گرفتار؟
ہو گردِ رہِ صفِ پسین کیوں؟ — اس بزم میں خوار ہو تمھیں کیوں؟
کیوں تیرِ ستم کے ہو نشانہ؟ — بگڑا ہے تمھیں سے کیوں زمانہ؟
کس نے تمھیں اوج سے اُتارا؟ — اقبال نے کیوں کیا کنارا؟
کیوں بار ہو تم دلِ زمیں پر — کیوں برقِ بلا گری تمھیں پر؟
کس پیچ میں رہ گئے ہو پھنسکر؟ — کیا ہے کہ اُجڑ گئے ہو بس کر؟
افلاس میں تم جو ہو گرفتار؟ — بیٹھے ہو نقشِ پا سے بیکار؟
شکوے ہیں جو بے زری کے تم کو — لالے ہیں جو نوکری کے تم کو
حرفت کو جو کر چکے ہو غارت — برباد جو ہو چکی تجارت
ہر علم و ہنر سے بے خبر ہو — صنعت میں جو تم شکستہ پر ہو
مدخل جو نہیں کمال میں کچھ — وسعت جو نہیں خیال میں کچھ
افعال جو سخت مبتذل ہیں — تدبیر کے دست و پا جو شل ہیں
رونا ہے تمھیں اب آج جن کا — خود کردہ ہیں کیا علاج اِن کا
غفلت میں جو خوب سو چکے ہو — ہونا جو تھا - وہ ہو چکے ہو
دنیا کے نہ کام کے نہ دیں کے — افسوس! رہے نہ تم کہیں کے
نکبت کی گھٹا ہے سر پہ چھائی — افلاس کی ہر طرف دُھائی
اب عیش نصیب ہے - نہ آرام — گھر گھر میں مچا ہوا ہے کہرام
برباد پڑے ہیں کارخانے — نکبت نے مٹا دیے گھرانے
رونق کا اثر نہ عیش کی بو — اک خاک سی اُڑ رہی ہے ہر سو

امید کے دن کی ہو چکی شام — خورشید اب آگیا لبِ بام
اب وقتِ اخیر ہے خبر لو! — جو کچھ کرنا ہے اب بھی کر لو!
تا دیر وہ قوم کا فدائی — وہ خضرِ طریق رہنمائی
اٹھتے ہوئے جوشِ دل سے پیہم — عبرت کا دکھا رہا تھا عالم
افسانۂ غم سنا کے ٹھہرا — سوتوں کو جگا جگا کے ٹھہرا
جادو کی بھری ہوئی وہ تقریر — ہونٹوں سے ٹپک رہی تھی تاثیر
ترغیب کے ساتھ ساتھ تہدید — کچھ یاس۔ تو کچھ نویدِ امید
کچھ لطف بھی تھا عتاب کے ساتھ — تھا زہر پہ قندِ ناب کیساتھ
باتوں میں اثر تھا کس بلا کا — اک بار جو رخ پھرا ہوا کا
امید کی بڑھ گئی تگ و تاز — اونچی ہوئی حوصلوں کی پرواز
خواہش کے بدل گئے ارادے — ہمت نے قدم بڑھائے آگے
وہ دوڑ چلے جو پابگل تھے — آندھی ہوئے جو فسردہ دل تھے
جو تھا وہ عجیب جوش میں تھا — مخمور بھی اب تو ہوش میں تھا
اب ملک کے ڈھنگ تھے نرالے — اخبار کہیں۔ کہیں رسالے
تعلیم کے جابجا وہ جلسے — گھر گھر میں ترقیوں کے چرچے
بیتاب ہر ایک جزو و کل تھا — ہر بار "بڑھے چلو" کا غل تھا

نومیدی از وصالِ تو طاقت گداز بود
صد جا گرہ زدیم امیدِ بریدہ را

اسلام کی حالتِ زبوں کا
آنکھوں میں جو پھر گیا تھا نقشا
تھا صبر و شکیب کا نہ یارا
غیرت نے دلوں کو پھر ابھارا
تدبیرِ مرض کی جستجو تھی
ہر بزم میں اب یہ گفتگو تھی
یعنی روشِ علاج کیا ہو؟
بیمار کو کس طرح شفا ہو؟
کیا ہو کہ ابھر چلیں ذرا ہم؟
اس قیدِ بلا سے ہوں رہا ہم؟
یہ پھانس چبھی ہوئی نکل جائے
بیمارِ اجل ذرا سنبھل جائے
وابستۂ غم کی جاں بری ہو
سوکھی ہوئی شاخ پھر ہری ہو
یہ قوم کی بیکسی تو جائے
یعنی یہ مریض جی تو جائے
تھی بسکہ ہر ایک کو یہی فکر
برسوں یہی بحث تھی یہی ذکر
ہر بزم میں تذکرہ یہی تھا
ہر شخص کا مشغلہ یہی تھا
دانش طلبانِ نکتہ داں نے
عیسیٰ نفسانِ خوش بیاں نے
ترتیب دیئے بکاوش و کد
بتیس رسالہاے مفرد
لکھے بدلائل و براہیں
اس بحث پہ مختلف مضامیں
وہ نکتہ ورِ حقیقت آگاہ
یعنی مہدی[1] علی ذی جاہ
سید اشرف علی ممتاز
مشتاق حسین[2] نکتہ پرداز
ان کے قلمِ گہرفشاں نے
آئینِ گذارشِ بیاں نے
آسان کر دی ہر ایک مشکل
ناطے شدہ رہ گئی نہ منزل
جو بحث تھی دلنشین کی تھی
ہر بات کی چھان بین کی تھی

[1] نواب محسن الملک ، [2] نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب ؛

اسلام کا وہ عروجِ شاہی
وہ اوج وہ شانِ کجکلاہی

ایوانِ علوم کی وہ تزئین
تحصیلِ کمال کے وہ آئین

تکمیلِ فنون میں توغل
اک بار پھر اُن کا وہ تنزل

اس طرح غرض کہ جزر و مد کا
کھینچا تھا وہ ٹھیک ٹھیک نقشا

تصویر سی پھر گئی نظر میں
جان آگئی قالبِ اثر میں

اسباب و علل سے بحث کی پھر
یعنی کہ "یہ انقلابِ نادر

کس بات سے ہے؟ سبب ہوا کیا؟
وہ باعثِ اوج اب ہوا کیا؟

پھر اصلِ سخن پہ کی جو تقریر
یعنی روشِ علاج و تدبیر

تحقیق کے طے کئے مراحل
وا کر دیے عقدہائے مشکل

تدبیر کی صورتیں بتائیں
جو جو تھیں ضرورتیں بتائیں

القصہ یہ بات کی تھی تسلیم
یعنی کہ علومِ نو کی تعلیم

تدبیرِ شفا جو ہے، تو یہ ہے
اس دُکھ کی دوا جو ہے۔ تو یہ ہے

سہتے ہیں جو یوں غم و تعب ہم
تدبیر یہی ہے بس کہ" اب ہم

تقویمِ کہن سے ہاتھ اٹھائیں
تہذیب کے دائرے میں آئیں

سیکھیں وہ مطالبِ نو آئیں
یورپ میں جو ہو رہے ہیں تلقین

تہذیب کے وہ اصولِ نایاب
وہ طرزِ معاشرت کے آداب

وہ گنجِ گرانِ دانش و فن
وہ فلسفۂ جدیدِ بیکن

کیپلر کی وہ نکتہ آفرینی
نیوٹن کے مسائلِ یقینی

اس فیض سے ہم بھی بہرہ ور ہوں
ہم بھی اسی کان کے گہر ہوں

جوہر جو کمال کے دکھائیں
اس بزم میں ہم بھی بار پائیں

ہمت کے کھلیں جو بال پرواز
اس اوج میں ہم بھی ہوں عناں تاز

گو صعب نہیں ہیں یہ مراحل
ہم کو ہے مگر یہ تازہ مشکل

قائم ہیں جو آج درسگاہیں
جن پر ہیں اٹھی ہوئی نگاہیں

سرکار سے ہے قیام جن کو
حاصل ہے قبولِ عام جن کو

اوروں کی اگرچہ رہنما ہیں
ان کے لیے نسخۂ شفا ہیں

جس غم سے مگر تباہ ہیں ہم
اس زخم کے یہ نہیں ہیں مرہم

اس درد کی یہ دوا نہیں ہیں
ناخن یہ گرہ کشا نہیں ہیں

پیاسے نہیں ہم اس ابر و یم کے
درماں یہ نہیں ہمارے غم کے

اپنے تو یہ چارہ گر نہیں ہیں
ہر چند کہ ہیں، مگر نہیں ہیں

تعلیم ہی صرف ہو جو مقصود
کافی ہے یہ جس قدر ہے موجود

ادبار کے ہیں مگر جو آثار
ہم ایک ہیں اور ہزاروں آزار

ذلت سے بھری ہر ایک خو ہے
افلاس میں سفلہ پن کی بو ہے

آئینِ معاشرت میں بھی ہم
محتاج ہیں تربیت کے اس دم

تہذیبِ خیال بھی ہے درکار
تحصیلِ کمال بھی ہے درکار

مقصود ہے دولتِ یقیں بھی
تعلیمِ اصولِ شرع و دیں بھی

تکمیلِ طریقِ پاک بازی
ترویجِ شریعتِ حجازی

درسِ لغتِ عرب کم و بیش
اتنی جسے مشکلیں ہوں درپیش

پھر غیر سے کیا ہو چارہ جوئی؟
کس کس کا کرے علاج کوئی

تدبیر یہ ہے کہ اب سنبھل کر — ہم آپ کھڑے ہوں اپنے بل پر
وابستۂ غیر تھے اگر ہم — اب آپ ہوں اپنے چارہ گر ہم
اس دشت کو طے کریں سراسر — ہم آپ دلیلِ راہ بن کر
قائم ہو باتفاق باہم — اک مدرستہ العلوم اعظم
جو قوم کا مامن و مقر ہو — درماں ہو۔ طبیبِ چارہ گر ہو
وہ کعبۂ آرزو ہمارا — ہر غم میں ہو چارہ جو ہمارا
آئین و اصولِ فن بتائے — آدابِ معاشرت سکھائے
وہ درس گہِ خجستہ انجام — ہو پشت و پناہِ قومِ اسلام
ہر عقدۂ آرزو کرے وا — مرکز ہو ہماری حاجتوں کا
سامان روائیے غرض ہو — یعنی کہ دوائے ہر مرض ہو
درماں ہو مریضِ خستہ جاں کا — مرہم ہو جراحتِ نہاں کا

مشاطہ را بگو کہ براسبابِ حسنِ یار
چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسید

والا گہرانِ قوم نے اب — اک مجلسِ تازہ کی مرتب
دیباچۂ نامۂ سعادت — یعنی وہ خزینۃ البضاعت
رائیں ہوئیں متفق جو سب کی — اب قوم سے یاوری طلب کی
وہ کشتۂ قوم وہ فدائی — اٹھا لئے کاسۂ گدائی
ایک ایک سے عرضِ حال کرتا — در در وہ پھرا سوال کرتا

ہر بزم و ہر انجمن میں پہونچا | ہر باغ میں ہر چمن میں پہونچا

کاوش سے غرض تھی کچھ نہ کد سے | ملتا تھا ہر ایک نیک و بد سے

مردانِ خدا پرست سے بھی | رندانِ سیاہ مست سے بھی

ہر زاہد و بادہ خوار سے بھی | ملتا تھا وہ گل سے خار سے بھی

ٹھہرا نہ جو گرم سیر ہو کر | کعبے بھی گیا وہ دیر ہو کر

مطلب، تھا جو خوب و زشت سے بھی | گذرا حرم و کنشت سے بھی

پستی سے ملا فلک کی صورت | ذرّوں میں رہا چمک کی صورت

صوفی، عالم، رشید و گمراہ | والا گہرانِ صاحب جاہ

دانش طلبانِ نکتہ اندوز | کم حوصلگانِ حیلہ آموز

مطلب کا ہر اک سے تھا طلبگار | ہر خوان سے تھا وہ زلہ بردار

گذرا وہ ہر ایک رہگذر پر | دی اس نے صدا ہر ایک در پر

کس بزم میں یہ فغاں نہ پہنچی؟ | آہ اس کی کہاں کہاں نہ پہونچی؟

ہر اک کو یہ ماجرا سنایا | ہر بزم میں اپنا راگ گایا

نالے کئے داغِ دل دکھا کر | رو دیا کبھی حالِ غم سنا کر

کیا کیا نہ مصیبتیں اٹھائیں | ہر طرح کی ذلتیں اٹھائیں

ناکام رہا صدائیں دے کر! | دشنام سنی دعائیں دے کر!

حنظل پائے شکر کے بدلے! | سنگ اس کو ملے گہر کے بدلے!

لعل اس نے دیئے شرار پائے! | گل نذر کئے تو خار پائے!

کیا تلخ ملے جواب اس کو! | کیا کیا نہ دیئے خطاب اس کو!

برگشتہ کہا کسی نے دیں سے! لعنت کا صدا ملا کہیں سے
خود قوم کو ہو گئی تھی یہ کد زندیق کہا۔ کسی نے مرتد!
چرچے تھے یہی زغرب تا شرق وہ اپنی ہی دھن میں تھا مگر غرق
گو ناوکِ ظلم کا ہدف تھا وہ شیفتہ پھر بھی سر بکف تھا
منظور جو قوم کا تھا اعزاز ذلت پہ بھی اپنی تھا اُسے ناز
دشنام کو وہ دعا ہی سمجھا! وہ درد کو بھی دوا ہی سمجھا
جور اُس نے سہے کرم کے بدلے! لطف اس نے کیئے ستم کے بدلے
ہر چند یہ مشکلیں تھیں درپیش گو غیر تھے سب یگانہ و خویش
دل کو نہ رہا تھا آسرا بھی یاروں میں وفا نہ تھی ذرا بھی
بیگانہ عزیز خویش ٹھہرا سمجھا جسے نوش نیش ٹھہرا
یہ زحمتیں گو تھیں ساتھ اُس کے پر زور تھے پر جو ہاتھ اس کے
آگے وہ بڑھا، ہٹا کے سب کو طے کر کے رہا رہِ طلب کو
آئے تھے جو سنگِ راہ بن کر سب اُڑ گئے برگِ کاہ بن کر
ناکام رہے وہ جن کو تھی لاگ خاشاک سے دب سکی نہ یہ آگ
کی خس نے اگرچہ لاکھ تدبیر صرصر کا نہ ہو سکا عناں گیر
آتش پہ ٹھہر سکا نہ سیماب خاشاک سے رک سکا نہ سیلاب
باطل کو جو حق نے کر دیا پست اب نیست نے پائی صورتِ ہست
آہوں نے دکھائی اُس کی تاثیر کام آئے وہ نالہاے شب گیر
پُر درد جو اس کی داستاں تھی لبریز اثر جو وہ فغاں تھی

ٹھنڈے ہوئے تھے جو گرم خو بھی
دل تھام کے رہ گئے عدو بھی

ہمت تھی جو شمع راہ اس کی
خالی نہ گئی وہ آہ اُس کی

ہونی تھی کہ قوم کے پھریں دن
نالے نہ رہے اثر کئے بن

آمادہ ہوئے برائے امداد
عالی منشان صاحبِ داد

وہ اوج فزائے شوکت و جاہ
سرکار نظام خلّد اللہ

وہ مستندِ عدالت و داد
یعنی وہ رئیس مصطفےٰ باد

وہ صاحبِ سیرتِ رضیہ
دستورِ کبیر آصفیہ

تھے ملک میں اور بھی جو ذی جاہ
اسلام کے یاور و ہوا خواہ

فیاضیوں کے دکھائے آثار
یا ابرِ کرم ہوا گُہر بار

امید نے بھی برغم دشمن
بھر بھر لئے اپنے جیب و دامن

واں بحرِ کرم کو آگیا جوش
یاں مطلب و آرزو تھی ہم دوش

پیدا جو ہوا خیالِ غیرت
یہ تھا اثرِ کمالِ غیرت

اس جوش میں بھر گئے بد و نیک
تھا چور اسی نشے میں ہر ایک

نادار تھا یا کہ اہلِ زر تھا
ہر اک کا یہ مطمحِ نظر تھا

"روشن ہو یہ شمعِ راہ حاجت
تعمیر ہو قبلہ گاہِ حاجت"

آخر بہزار جاہ و اجلال
طالع ہوا آفتابِ اقبال

روشن ہوئی بزم گاہِ اُمید
نکلا افقِ شرف سے خورشید

قائم ہوا یادگارِ ایام
وہ مدرسۃ العلوم اسلام

بنیاد کی تھی جو دل ربا رسم
کس شان سے یہ ہوئی ادا رسم

مجمع تھا جو اہلِ علم و فن کا — کچھ ڈھنگ نیا تھا انجمن کا
کس شوق سے تھے شریکِ صحبت — عالی نشانِ قوم و ملّت
جن کو کہ یہ دھن لگی تھی جی سے — پھولے نہ سماتے تھے خوشی سے
تھا لارڈ ولٹن جو صدرِ محفل — فرزانہ و ہوشمند و عاقل
بنیاد کے سنگِ اوّلیں کو — رکھا تو کہا کہ:- اے عزیزو!
گو سرورِ انجمن ہے یورپ — سرچشمۂ علم و فن ہے یورپ
با ایں ہمہ جاہ و شوکت و فر — ہے اہلِ عرب کا سایہ پرور
سیکھے ہیں اصولِ فن انہی سے — لی ہے روشِ سخن انہی سے
ہوں آج جو میں شریکِ محضر — رکھتا ہوں جو اس بنا کا پتھر
مقصود یہ ہے۔ یہ چاہتا ہوں — اس حق سے کسی قدر ادا ہوں
خالق سے دعا ہے اب کہ جاوید — روشن رہے یہ چراغِ امید!
ذرہ ہے تو مہرِ آسماں ہو — قطرہ ہے تو بحرِ بیکراں ہو!

زشرحِ قصّۂ ما رفتہ خواب از چشم خاصاں را
شب آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد

یہ حاصلِ نالہاے شبگیر — یہ قوم کی آرزو کی تصویر
یہ اوج دہِ خیالِ اُمید — یہ قوم کا نونہالِ اُمید
صد شکر کہ آج بار ور ہے — جو شاخ ہے اس کی پُر ثمر ہے
لایا ہے وہ برگ و بار کیسا! — اعدا کو ہے خار خار کیسا!

بخت اس کا جو آج اوج پر ہے
ہر لحظہ برونقِ دگر ہے،

یہ اس کی ترقیوں کا ہے طور
کل اور تھا آج ہو گیا اور

پہلے سے بہ آب و تاب ہے آج
کل شمع تھا۔ آفتاب ہے آج

اس چشمۂ فیض سے ہے سیراب
بنگال سے تا حدودِ پنجاب

دانش طلبانِ قوم اکثر
ہیں جمع ہر ایک جگہ سے آکر

کس نخل کے یاں ثمر نہیں ہیں
کس کان کے یاں گہر نہیں ہیں

اس باغ میں کوئی آکے دیکھے
اسلام کے ہونہار پودے

ہرچند یہ اوج ہے! یہ شان ہے!
وہ بات مگر ابھی کہاں ہے؟

سامان جو اتنے کچھ بہم ہیں
ہرچند بہت ہیں۔ پھر بھی کم ہیں

جس دشت میں فکر ہے عناں تاز
جس اوج پہ ہے ہوس کی پرواز

جو پیشِ نہاد آرزو ہے
جس سمت عنانِ جستجو ہے

جس کے لئے ناصبور ہیں ہم
اس حد سے ہنوز دور ہیں ہم

ناطے شدہ منزلِ طلب ہے
امید ہنوز تشنہ لب ہے

باقی ہیں بہت سے کام ابتک
تعمیر ہے ناتمام ابتک

آتا ہے یہاں جو کوئی ممتاز
سنتا ہے یہ بام و در سے آواز

"اے قوم! کہاں ہے تو کدھر ہے
کیوں حال سے میرے بیخبر ہے

تو۔ اور مری خبر نہ لے۔ قوم!
کس نیند میں سو گئی ہے؟ اے قوم"

جو لوگ دکھا چکے ہیں ہمت
ان سے تو نہیں ہے کچھ شکایت

افسوس تو ان پہ ہے۔ کہ اب بھی
ہیں گم شدۂ رہِ ترقی!

جلوے جو دکھا رہا ہے ادبار
اوہام غلط میں ہیں گرفتار

اب تک بھی جو برسرِ کجی ہیں
گو اپنے ہیں پھر بھی اجنبی ہیں

سچ یہ ہے کہ جب ضد آ پڑی ہے
پھر قوم کی اُن کو کیا پڑی ہے

گو قوم شکستہ حال ہو جائے
برباد ہو پائمال ہو جائے

افلاس میں ٹھوکریں بھی کھائے
اغیار کے ناز بھی اٹھائے

پوچھے کوئی بد نہ نیک اس کو
ٹھکرا کے چلے ہر ایک اس کو

سہنے ہیں پڑے اُسے شب و روز
اغیار کے طعنہ ہائے دل دوز

یاور نہ کوئی۔ نہ چارہ گر ہو
ہے خوار۔ تو اور خوار تر ہو

ہر ایک کے دل پہ بار ہو کر
مٹ جائے ذلیل و خوار ہو کر

یہ سب ہو پر ان کی ضد نہ جائے
حق بات کبھی نہ دل میں آئے

گو قوم پہ لاکھ آفتیں آئیں
ممکن ہے کہ یہ ذرا بدل جائیں

جاتے نہیں وہم باطل ان کے
پتھر سے بنائے ہیں دل ان کے

اتنے جو نہ کج خیال ہوتے
کیوں آج شکستہ حال ہوتے ؟

سید سے اگر ہے بغض للہ
وہ خادمِ قوم اگر ہے گمراہ

کچھ آپ ہی انتظام کرتے
اسلام کو نیک نام کرتے

باتیں نہ فقط بنا کے رہتے
جو منہ سے کہا دکھا کے رہتے

اسلام کی دوستی تو یہ تھی
الفت کی دلیل تھی، تو یہ تھی

یہ وقت جو آ پڑا ہے مشکل
ہے پردہ کشائے حق و باطل

اک عرضہ گہِ قبول و رد ہے
معیارِ تمیز نیک و بد ہے،

یاں حال کھلے گا این و آں کا | دنگل ہے وفا کے امتحاں کا
اے مدعیانِ حبِ اسلام! | حجروں میں تو اب کرو نہ آرام!
دعوے ہیں۔ تو کچھ ہنر دکھاؤ! | ہمت کے قدم ذرا بڑھاؤ!
دیکھو! رہِ جستجو یہی ہے! | میدان یہی ہے! گو یہی ہے
انداز عرب اگر ہے خو میں! | باقی ہے وہ جوش اگر لہو میں!
موقع ہے یہی ہنر دکھاؤ! | جو کہتے تھے، آج کر دکھاؤ!
کر دو جو گذشتہ کی تلافی! | ثابت ہو زمانے پر کہ اب بھی
گو دورِ فلک ہوا دگرگوں | پھر بھی تو رگوں میں ہے وہی خوں
اسلاف کے وہ اثر ہیں اب بھی | اس راکھ میں کچھ شرر ہیں اب بھی
اس حال میں بھی روش وہی ہے | دن ڈھل بھی گیا تپش وہی ہے
اس جام میں ہے شراب باقی! | اب تک ہے گہر میں آب باقی
گو خار ہیں۔ طرز و خو وہی ہے | مرجھا گئے پھول، بو وہی ہے

ھٰذَا وَلَقَدْ بَلَغْتُ اَقْصَاہُ،
فَاسْعَوْا! وَتَوَکَّلُوْا عَلَی اللّٰہِ!

راقم

سرگذشت عہدِ گل را ہم ز شبلی[۱] می شنو
عندلیب آشفتہ تر گفت ست ایں افسانہ را

[۱] اصل میں یہ شعر نظیری کا ہے،

یعنی وہ

قومی مسدس

جس کو

جناب علامہ شبلیؒ نے سرسید کے قومی تھیٹر علیگڈھ میں فروری ۱۸۹۴ء

میں اپنی پُر درد و پرسوز لہجہ میں پڑھا تھا

آج کی رات یہ کیوں جمع ہیں احباب بہم | بھیڑ کیا ہے نظر آتا ہے یہ کیسا عالم
نوجوانانِ ہنر پرور و اربابِ ہِمم | جوق کے جوق چلے آتے ہیں کیسے پیہم
کچھ سمجھ میں نہیں آتا جو یہ سب سمجھے ہیں
شاید اس بزم کو یہ بزمِ طرب سمجھے ہیں

ہے گماں اُن کو کہ آیا ہے تھیٹر کوئی | یا کہ اس سے بھی تماشا ہے یہ بڑھ کر کوئی
اس سبھا میں بھی نظر آئے گا اِندر کوئی | مسخرا بن کے بھی آئے گا مقرر کوئی
نقل وہ ہوگی کہ دیکھی نہ سنی ہوگی کبھی
سیر وہ آج کریں گے کہ نہ کی ہوگی کبھی

کوئی کہتا ہے تھیٹر تو نہیں ہے لیکن ساز و نغمہ بھی نہ ہو ساتھ نہیں ہے ممکن
راتیں کاٹی ہیں اسی شوق میں تارے گن گن دیکھیں کیا سیر دکھائیں یہ بزرگانِ مِسن

کچھ نہ کچھ تازہ کرامات تو ہو گی آخر
بوڑھے غمزوں میں کوئی بات تو ہو گی آخر

دوستو کیا تمھیں سچ مچ تھا تھیٹر کا یقیں کیا یہ سمجھے تھے کہ پردہ کوئی ہوگا رنگیں
نظر آئے گی جو سوتی ہوئی اک زہرہ جبیں آئے گا پھول کے لینے کو ارم کا گلچیں

قوم کی بزم کو یوں کھیل تماشا سمجھے
ہائے گر آپ یہ سمجھے بھی تو بے جا سمجھے

ہائے افسوس کہ ہو قوم تو یوں خستہ و زار مرض الموت میں جس طرح سے کوئی بیمار
نہ معالج ہو کوئی پاس نہ سر پہ غمخوار نظر آتے ہوں دمِ نزع کے سارے آثار

واں تو یہ حال کہ مرنے میں بھی کچھ دیر نہیں
آپ ادھر سیر تماشے سے ابھی سیر نہیں

نوحۂ غم ہے یہاں نغمۂ عشرت کیسا ہے یہ عبرت کا سماں جوشِ مسرت کیسا
ہے جنوں خیز یہ ہنگامۂ عبرت کیسا قوم کا حال ہے غفلت کی بدولت کیسا

ہے عجب سیر اگر دیدۂ بینا دیکھے
دیکھنا ہو جسے عبرت کا تماشا دیکھے

ہائے کیا سین ہے یہ بھی کہ گروہِ شرفا صاحبِ افسر و اورنگ تھے جن کے آبا
قوم کے عقدۂ مشکل کے ہیں جو عقدہ کشا ایکٹر بن کے وہ اسٹیج پہ ہیں جلوہ نما

قوم کے خوابِ پریشاں کی یہ تعبیریں ہیں

ایکٹر یہ نہیں عبرت کی یہ تصویریں ہیں

بانیِ مدرسہ وہ سیّد والا گوہر
وہ مینیجنگ کمیٹی کے معزز ممبر

شبلیِ غمزدہ وہ شاعرِ اعجاز اثر
اور یہ نوبادۂ اقبال کے سب برگ و ثمر

نہ تکلف کے کچھ انداز نہ کچھ جاہ کی شان
بزم میں آئے ہیں اس حال سے اللہ کی شان

اپنے رتبوں کا نہ کچھ دھیان نہ کچھ وضع کا پاس
دوستوں سے نہ جھجھک اور نہ دشمن سے ہراس

گرچہ سب کہتے ہیں حاصل نہیں کچھ بھی جز یاس
ہائے کیا دھن ہے کہ پھر بھی تو نہیں ٹوٹتی آس

عرضِ مطلب کی ہے تصویر سراپا اُن کا
ہاتھ خود کاسۂ دریوزہ ہے گویا اُن کا

اُن کا ہر لفظ ہے اک مرثیۂ جاں فرسا
قوم کی شان دکھا دیتی ہے ایک ایک ادا

دیکھ اے قوم جو اب تک ہو نہ تو نے دیکھا
اپنے بگڑے ہوے انداز کا پورا خاکا

گرچہ تدبیر بھی ہم سے نہیں کچھ کی جاتی
ہائے حالت بھی تو تیری نہیں دیکھی جاتی

یوں بھلانے کو تو ہم دل سے بھلاتے ہیں مگر
یاد آجاتے ہیں پھر بھی ترے اگلے جوہر

وہ بھی اک دن تھا کہ جس سمت سے ہوتا تھا گذر
ساتھ چلتے تھے جلو میں ترے اقبال و ظفر

تو کبھی روم میں قیصر کو مٹا کر آئی
کبھی یورپ میں نئے فتنے اٹھا کر آئی

تھے نقیبوں میں ترے دولت و اقبال و حشم
تیرے حملوں سے دہل جاتا تھا سارا عالم

ایشیا کا جو کیا تو نے مرقع برہم
جا کے یورپ کے افق پر بھی اڑایا پرچم

کر دیا دفترِ تاتار کو ابتر تو نے
نیزہ گاڑا تھا جگر گاہِ تتر پر تو نے

کون تھا جس نے کیا فارس و یوناں تاراج
کس کی آمد میں فدا کر دیا جیپال نے راج
کس کو کسریٰ نے دیا تختِ و زر و افسر و تاج
کس کے دربار میں تاتار سے آتا تھا خراج

تجھ پہ اے قوم اثر کرتا ہے افسوں جن کا
یہ وہی تھے کہ رگوں میں ہے ترے خوں جن کا

ہم نے مانا بھی کہ دل سے یہ بھلا دیں قصّے
یہ سمجھ لیں کہ ہم ایسے ہی تھے اب ہیں جیسے
یہ بھی منظور ہے ہم کو کہ ہمارے بچے
دیکھنے پائیں نہ تاریخِ عرب کے صفحے

کبھی بھولے بھی سلف کو نہ کریں یاد اگر
یادگاروں کو زمانہ سے مٹا دیں کیونکر

مرو و شیراز و صفاہاں کے وہ زیبا منظر
بیت حمرا کے وہ ایوان وہ دیوار وہ در
مصر و غرناطہ و بغداد کا ایک ایک پتھر
اور وہ دہلی مرحوم کے بوسیدہ کھنڈر

اُن کے ذروں میں چمکتے ہیں وہ جوہر اب تک
داستانیں انھیں سب یاد ہیں از بر اب تک

اُن سے سُن لے کوئی افسانۂ یارانِ وطن
یہ دکھا دیتی ہیں آنکھوں کو وہی خوابِ کہن
تیرے ہی نام کا اے قوم یہ گاتے ہیں بھجن
تیرے ہی نغمۂ پُردرد کے ہیں یہ ارگن

پوچھتا ہے جو کوئی اُن سے نشانی تیری
یہ سنا دیتے ہیں سب رام کہانی تیری

قصیدۂ اردو

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۹۳ء میں پڑھا گیا

بجا ہو آج گر اس بزم میں یہ زیب ساماں ہیں — یہ ان کی بزم ہے جو یادگارِ نسلِ عدناں ہیں

خلیل اللہ سے مہماں نوازی جنکو پہنچی ہے — ہزاروں کوس سے آ کے وہ اس گھر میں مہماں ہیں

فقط اک جذبۂ قومی انھیں واں کھینچ لایا ہے — جہاں زورِ حکومت ہو نہ حاجب ہیں نہ درباں ہیں

ہماری خدمتوں کا داد ٹھانے آئے ہیں احساں — کہ اسلامی جماعت پر ہزاروں جن کے احساں ہیں

ہنر میں علم میں، اخلاق میں مجد اور شرافت میں — یہی وہ صورتیں ہیں جن پہ ہم تم آج نازاں ہیں

خدا نے ان کو بخشی ہو حکومت اور سطوت بھی — کہ جسمِ سلطنت کے یہ جوارح اور ارکاں ہیں

مگر ان کو کسی عزت پہ نازش ہے تو اس پر ہو — کہ یہ اسلام کے ہیں نام لیوا اور مسلماں ہیں

نہ عہدوں کا تفاوت ہو نہ کچھ فرقِ مراتب ہو — یہاں جس سادگی سے یہ شریکِ بزمِ اخواں ہیں

معمر بھی ہیں ان میں نوجواں بھی اور کم سن بھی — مگر شانِ اخوت میں مدارج سب کے یکساں ہیں

یہ وہ ہیں جن میں ہو اسلاف کا ابتک اثر باقی — یہ وہ ہیں جن میں جوہر نسلِ عدنانی کے پنہاں ہیں

انھی کے بازوؤں میں زور تھا کشور ستانی کا — انھی کی یادگاریں جابجا ابتک نمایاں ہیں

یہ وہ ہیں جان و دل سے جو فدائے قوم و ملت ہیں — یہ وہ ہیں نامِ اسلام کے جو دل سے قرباں ہیں

نہ ہوگا ایک بھی دل۔ دردِ قومی سے جو خالی ہو — بظاہر گرچہ سب مسرور ہیں، خرم ہیں شاداں ہیں

انھیں احساس ہے اپنی ملت کی تباہی کا
یہ واقف ہیں کہ بیڑی قوم کے غرقِ طوفاں ہیں

انھیں معلوم ہے جس تاک میں ہے گردشِ گردوں
انھیں محسوس ہے جس گھات میں ایامِ دوراں ہیں

خبر ہے ان کو جس آزار میں چھوٹا بڑا ہے اب
یہ واقف ہیں کہ پہلے قوم کیا تھی اور کیا ہے اب

علاج اپنا ہم ابتک تو سمجھتے تھے کہ آساں ہے
مگر وہ درد نکلا جس کو ہم سمجھے تھے درماں ہے

دوا ہر بار جب اپنا اثر اولٹا ہی دکھلائے
تو بس سمجھو کہ اب بیمار کوئی دم کا مہماں ہے

جو سچ پوچھو تو ہے اسلامیوں کی اب یہی حالت
مرض دونا بڑھا دیتی ہے خود وہ شے جو درماں ہے

سلف کا تذکرہ جو ہمت و غیرت کا ہے افسوں
ہمارے حق میں وہ سرمایۂ خوابِ پریشاں ہے

یہ افسانے بڑھاتے ہیں ہماری نیند کی شدت
یہ افسوں حق میں اپنے اور مدہوشی کا ساماں ہے

ہمیں احساس تک ہوتا نہیں اپنی تباہی کا
کہ سب پیشِ نظر اسلاف کی شوکت و شاں ہے

ہماری کلفتیں سب دور ہو جاتی ہیں یہ سنکر
کہ دنیا آج تک اسلام کی ممنونِ احساں ہے

مزے لیتے ہیں پہروں تک کسی سے جب یہ سنتے ہیں
کہ یورپ دولتِ عباس کا ابتک ثنا خواں ہے

نہیں رہنے کو یاں گھر تک مگر چرچے یہ رہتے ہیں
کہ ابتک قصرِ حمرا قبلہ گاہِ رہ نورداں ہے

ہیں خود ان پڑھ مگر اس زعم میں اترائے پھرتے ہیں
کہ دنیا میں ہمیں سے زندہ ابتک نامِ یوناں ہے

نظر آتے ہیں ہم کو عیب اپنے خوبیاں بنکر
ہم اپنے جہل کو بھی یہ سمجھتے ہیں کہ عرفاں ہے

بسر ہوتی ہے گر اوقات فیاضی پہ غیروں کی
تو سمجھے ہیں کہ بس زہد اور توکل کی یہی شاں ہے

حمیت اور خودداری نہیں ہے گر طبیعت میں
تو اچھا ہے کہ مسکینی تو اول شرطِ ایماں ہے

طبیعت میں اگر ہیں فتنہ پردازی کے کچھ جوہر
تو دعویٰ ہے کہ تدبیر اور سیاست فنِ انساں ہے

وہ قوم اور وہ جماعت جس میں یہ اخلاق محکم ہیں

بلائیں اُسپہ جو آئیں وہ کم ہیں اور بہت کم ہیں

یہ جو کچھ سُن چکے ہو قوم کی تم حالتِ ابتر
نہ سمجھو یہ کہ ہے اس داستاں کا خاتمہ ابتر

ہماری سب سے بڑھکر بدنصیبی جو ہے وہ یہ ہے
کہ بے پروا ہیں وہ بھی قوم کے جو آج ہیں لیڈر

گیا وہ وقت ہم کو ناصحوں کی جب ضرورت تھی
فلک نے کر دیا اک اک کو آپ اپنا نصیحت گر

گیا وہ وقت جب تھا بس اسی کا نام ہمدردی
کہ دو آنسو بہالیں قوم کی درماندہ حالت پر

گئے وہ دن کہ ہم محتاج تھے عبرت دلانے کے
ہمارا حال خود عبرت فزا ہے آج سر تا سر

ضرورت اب ہے گر ہمکو تو بس ہے اُن بزرگوں کی
کہ جنمیں خیر سے کچھ کر دکھانے کے بھی ہوں جوہر

فقط باتیں نہ ہوں کچھ کام بھی بن آئے ہاتھوں سے
کہیں جو کچھ وہ منھ سے کر دکھائیں اس سے کچھ بڑھکر

نہیں گر یہ، تو بس اک گرمیٔ صحبت کے ساماں ہیں
یہ قومی مرثیے، یہ وعظ، یہ اسپیچ، یہ لکچر

طلب اور سعی سے کچھ کام بن آئے تو بن آئے
فصاحت اور بلاغت کا بس اب چلتا نہیں منتر

تمھیں جو کام ہیں درپیش گو مشکل سے مشکل ہیں
مگر کرنے پہ آجاؤ تو آساں سے ہیں آساں تر

ابھی تک تم میں ہے اسلاف کا کچھ کچھ اثر باقی
شرر گو بجھ چکے پر گرم ہے اب تک وہ خاکستر

ابھی کچھ کچھ مہک باقی ہے ان مرجھائے پھولوں میں
ابھی کچھ کاٹ ہے اس تیغ میں گو مٹ چکے جوہر

کمی جس بات کی یا نقص جو تم میں ہے وہ یہ ہے
کہ تم ان قوتوں کو صرف بیجا کرتے ہو اکثر

وہی فیاضیاں تم میں ہیں جو تھیں معن و حاتم میں
مگر بیہودہ رسموں کیلئے وہ وقف ہیں یکسر

کچھ اس سے کم ہوا تھا صرف تجہیز اُسامہ میں
لٹا دیتے ہو تقریبوں میں جتنا تم زر و زیور

فقط آپس کے جھگڑوں میں تم اس سے کام لیتے ہو
وہ جودت اور ذہانت جسمیں اب بھی تم ہو نام آور

سنبھلنا اب بھی گر چاہو تو ہے وقت اور ضرورت بھی
وگرنہ پھر نہیں رہنے کی جو کچھ ہے یہ حالت بھی

جو ۱۸۹۴ء میں پڑھا گیا

بزم احباب ہے پرجوش ہے جلسا کیسا
جم گیا پھر طرب و عیش کا نقشا کیسا

صفحۂ عیش کی سطریں ہیں برابر دیکھو
حسن و خوبی سے یہ مجمع ہے صف آرا کیسا

نوجواں جمع ہیں یا جوش کی تصویریں ہیں
ہیں نے اس بزم کا کھینچا ہے سراپا کیسا

جوش کی آتی ہیں ہر سو سے صدائیں کیسی
گونج اٹھا زمزمۂ عیش سے کمرا کیسا

اپنے ہی ہاتھ میں ہے عقدہ کشائی اپنی
کیا زمانہ کا گلہ چرخ کا شکوا کیسا

دیکھنا آپ کھڑے ہونگے ہم اپنے بل پر
غیر سے چارہ نوازی کا تقاضا کیسا

قوم کی رگ میں ہے ابتک وہی اسلاف کا خون
ہو کے پژمردہ بھی ہے یہ گل رعنا کیسا

اب بھی اس راکھ میں تھوڑے سے شرر ہیں پنہاں
اب بھی اک فتنہ ہے یہ شاہد زیبا کیسا

دیکھنا ذرہ کا چمکے گا ستارہ اک دن
دیکھنا قطرہ یہ بن جاتا ہے دریا کیسا

تم بھی سن لوگے حریفو کبھی انشاء اللہ
قافلہ قوم کا منزل پہ وہ پہنچا کیسا

کیا نہیں جانتے تم کون ہیں کیا چیز ہیں ہم
ہم سے واقف ہے زمانہ کا زمانہ کیسا

ہم بھی وہ سیل بلا تھے کہ عرب سے جو بڑھے
آگیا رو میں یہ سب عرصۂ دنیا کیسا

ہم الٹ دیتے تھے دنیا کا مرقّع دم میں
ہم سے پرشور تھا یہ گنبدِ مینا کیسا

ڈالدی کشورِ ایراں میں جو ہم نے ہلچل
گر پڑا خاک پہ تاجِ سرِ کسریٰ کیسا

سب کو ہے یاد کہ تاتار سے لیکر تا روم
ہم نے پامال کیا عرصۂ ہیجا کیسا

سب کو ہے یاد کہ اٹلی کے افق پر ہم نے
فتح و نصرت کا اڑایا تھا پھریرا کیسا

دیکھنا تجھ کو جو یورپ میں ہمارا ہو جلال
پوچھ اسپین سے تھا قلعۂ حمرا کیسا

ذکر آتا ہے ترقی کا تو آنکھوں میں وہیں
صاف پھر جاتا ہے بغداد کا نقشا کیسا

کچھ فقط تیغ و سناں ہی میں نہ تھے ہم مشہور
ہم نے ہر فن میں دکھایا ید بیضا کیسا

روشنی علم کی پھیلائی تھی پہلے ہم نے
ورنہ چھایا تھا زمانے میں اندھیرا کیسا

اب بھی اسلاف کے موجود ہیں جوہر ہم میں
دیکھنا جوش میں آتا ہے یہ دریا کیسا

اب بھی لندن میں غزالی کی ہے شہرت کیسی
اب بھی جرمن میں ہے بونصر کا چرچا کیسا

روم و اٹلی کے مدرسے میں کئی صدیوں تک
تھا سند فلسفۂ بو علی سینا کیسا

ہاں کمربستہ ہو اے قوم ترقی کے لئے
آج کے کام میں اندیشۂ فردا کیسا

نوجوانو! یہ زمانہ کو دکھا دینا ہے
اپنی قوت کو کیا قوم نے یکجا کیسا

قوم کے تازہ نہالانِ چمن ہو تم لوگ
دیکھیں پھل لاتا ہے یہ نخلِ تمنا کیسا

اے حریفو! تمہیں خالق کی قسم سچ کہنا
شبلیِ خستہ نے لکھا یہ قصیدہ کیسا

تمہید قصیدۂ مدح سلطان عبدالحمید خان

سنہ ۱۸۷۹ء

پھر بہار آئی ہے شاداب ہیں پھر دشت و چمن
بن گیا رشکِ گلستانِ ارم پھر گلشن

شعلہ زن پھر چمنستان میں ہوئی آتشِ گل
پھر صبا چلتی ہے گلشن میں بچا کر دامن

آگ پانی میں لگا دی ہے کسی نے شاید
حوض میں عکسِ گل و لالہ ہے یا جلوہ فگن

باغ میں بادِ بہاری کی جو آمد کی ہے دھوم
بہرِ تسلیم ہر اک شاخ کی خم ہے گردن

مسند آرائے تجمل جو ہوا شاہدِ گل
مرغِ گلشن یہ صدا دیتے ہیں الملک لمن

مستیاں کرتی ہوئی پھرتی ہے گلشن میں نسیم
جھومتے آتے ہیں بادل طرفِ صحنِ چمن

کوندتی برق ہے گھنگھور گھٹا چھائی ہے
بوندیاں پڑتی ہیں چلتی ہیں ہوائیں سن سن

شاخیں انگڑائیاں لیتی ہیں صبا ہے بدمست
وجد میں تال لگاتا ہے ہر اک برگِ سمن

ہلکے ہلکے وہ نسیمِ سحری کے جھونکے
نو عروسانِ چمن کا وہ نرالا جوبن

نرگسِ مست کی ہیں محوِ تماشا آنکھیں
وا کیا غنچۂ گل نے بھی تبسم سے دہن

سر نکالے ہیں حبابوں نے تہِ آب سے کیوں
نظر آتی نہ تھی پانی میں مگر سیرِ چمن

بسکہ ہر ذرہ ہے احسان طلبِ بادِ بہار
گرد بھی ہاتھ میں تھامے ہے صبا کا دامن

بادۂ عیش سے مخمور ہے از بسکہ ہر ایک
باغ از بسکہ ہے آسایش و راحت کا وطن

چونکتے ہیں جو کبھی خواب سے اطفالِ بہار
تھپکیاں دیتی ہے سونے کے لئے بادِ چمن

در تہنیت شادی کدخدائی

آنریبل جسٹس سید محمود (مرحوم)

پھر ہوا بادِ بہاری کا جو عالم میں عمل
چھا لیا سبزۂ نوخیز نے سب دشت و جبل

ناز سے سوئے چمن جاتی ہے پھر بادِ بہار
جھومتے آتے ہیں پھر صحنِ چمن میں بادل

سمتِ قبلہ سے جو اٹھتی ہیں گھٹائیں ہر بار
کہتی ہیں توبہ زاہد سے کہ اب کی تو سنبھل

نو عروسانِ چمن کے ہیں نرالے انداز
کہ صبا گود میں لیتی ہے تو جاتے ہیں مچل

کچھ عجب شان سے تنتے ہیں جوانانِ چمن
صحنِ گلزار ہے یا عیش و طرب کا دنگل

جھومتی چلتی ہے بیچ روشوں پر جو نسیم
غنچے کہتے ہیں چٹک کر کہ سنبھل دیکھ سنبھل

اے صبا باغ میں آنا تو دبے پاؤں ذرا
نیند میں سبزۂ خوابیدہ کے آئے نہ خلل

بوئے خوش سے یہ نسیمِ سحری کہتی ہے
حجرۂ غنچہ میں کیا کرتی ہے آ، سیر کو چل

اوجِ اقبال تو دیکھو کہ سلیماں کی طرح
سیر کرتے ہوئے پھرتے ہیں ہوا پر بادل

مژدہ اے بادہ کشو اب تمہیں ڈر کسکا ہے
ابر کا عالمِ بالا پہ بھی ہے اب تو عمل

ہاں وہاں بزم بیارائے و بہ پیمائے قدم
ہاں وہاں زمزمہ ای سنج و بفرمائے غزل

بادہ بر فرخیِ شادیِ محمود بہ نوش
آں کہ در انجمنِ فضل بود صدرِ اجل

آنکہ پیدا ز رخش معنیِ سرُّ لا بیہ
چوں بہ غیبت نتواں شرحِ تمنّا گفتن

آں کہ مضمر بہ دلش سیرتِ اسلافِ اُوَل
سخن اکنوں بہ خطابِ تو تواں کرد بدل

قوم کو ناز ہے اے سیدِ والا تجھ پر
جمع اسلام کو ہے آج تری ذات پہ بل

تیرے اسلاف کے موجود ہیں جو ہر تجھ میں
وہی ہمت، وہی اخلاق، وہی طرزِ عمل

ہیں تری نکتہ شناسی کے سراپا شاہد
فیصلے صدر میں تو نے جو لکھے قلّ و دلّ

اک جہاں مان گیا زورِ قلم کو تیرے
شرع کے معنیِ پیچیدہ کئے تو نے جو حل

آج ہم سب کی امیدوں کا جو مرکز ہے تو
تو بھی اس راہ میں اسلاف کی رفتار پہ چل

باپ کی طرح سے تو قوم کا ہے پشت و پناہ
جانشینی کے لئے کون ہے تجھ سے افضل

ایک عالم کو مسلّم ہے ترا فضل و کمال
پھر نہ مانے کوئی حاسد تو جنوں کا ہے خلل

قوم کی چارہ نوازی بھی ہے تجھ پہ لازم
تجھ کو خالق نے بنایا ہے جو مسعودِ ازل

مدح مقصود نہیں جوشِ محبت ہے یہ
میں نہیں وہ کہ لکھوں مدحِ اربابِ دُوَل

مجھ کو خود حسنِ طبیعت پہ ہے اتنا وہ غرور
کہ لکھوں مدح تو اپنا ہی لکھوں علم و عمل

میں بھی ہوں عنصریِ وقت جو محمود ہے تو
میں بھی ہوں نازِ سلف تو ہے اگر فخرِ اُوَل

جبکہ آمادۂ خوں ہو گئے کفارِ قریش
لاجرم سرورِ عالمؐ نے کیا عزمِ سفر

کوئی نوکر تھا، نہ خادم، نہ برادر، نہ عزیز
گھر سے نکلے بھی تو اس شان سے نکلے سرِ در

اک فقط حضرتِ بوبکرؓ تھے ہمراہِ رکاب
ان کی اخلاص شعاری تھی جو منظورِ نظر

رات بھر چلتے تھے دن کو کہیں چھپ رہتے تھے
کہ کہیں دیکھ نہ پائے کوئی آمادۂ شر

چونکہ سو اونٹ کا انعام تھا قاتل کے لئے
آپ کے قتل کو نکلے تھے بہت طالبِ زر

انہی لوگوں میں سراقہ خلفِ جعشم تھے
جن کو فاروقؓ نے کسریٰ کے پنہائے تھے گہر

تین دن رات رہے ثور کے غاروں میں نہاں
تھا جہاں عقرب و افعی کی حکومت کا اثر

بیمِ جاں، خوفِ عدو، ترکِ غذا، سختیٔ راہ
ان مصائب میں ہوئی اب شبِ ہجرت سے سحر

یاں مدینہ میں ہوا غل کہ رسول آتے ہیں
راہ میں آنکھ بچھانے لگے اربابِ نظر

لڑکیاں گانے لگیں ذوق میں آ کر اشعار
نغمہ ہائے "طلع البدر" سے گونج اٹھے گھر

ماں کی آغوش میں بچے بھی مچل جانے لگے
نازنینانِ حرم بھی نکل آئیں باہر

آلِ نجار چلے شہر سے ہو کر تیار — زرہ و جوشن و چار آئینہ و تیغ و سپر
دفعتًہ کوکبۂ شاہِ رسل آ پہونچا — غل ہوا، صلّ علیٰ خیر انامِ و بشر
جلوۂ طلعتِ اقدس جو ہوا عکس فگن — دفعتہً تارِ شعاعی تھا ہر اک تارِ بصر
طور پر حضرت موسیٰؑ کی صدا آتی تھی — آج ایک اور جھلک سی مجھے آتی ہے نظر
سب کو تھی فکر کہ دیکھیں یہ شرف کسکو ملے — میہماں ہوتے ہیں کس اوج نشیں کے سرور
سینے کہتے تھے کہ خلوت گہِ دل حاضر ہے — آنکھیں کہتی تھیں کہ دو اور بھی تیار ہیں گھر!
ہاں مبارک کرے اسے خاکِ حریم نبوی — آج سے تو بھی ہوئی خاکِ حرم کی ہمسر!

صلّ یارب، علیٰ خیر نبیؐ و رسول
صلّ یارب، علیٰ افضل جن و بشر

تعمیر مسجد نبوی صلعم

ہجرت کے بعد آپ نے پہلا کیا جو کام — تعمیر سجدہ گاہِ خدائے انام تھا
اک قطعۂ زمیں تھا کہ اس کام کیلئے — واقع میں ہر لحاظ سے موزوں مقام تھا
وہ قطعۂ زمیں تھا یتیموں کی ملکِ خاص — ہر چند قبرگاہ و گذرگاہِ عام تھا
چاہا حضورؐ نے کہ بہ قیمت خرید لیں — ان کے مربیوں سے کہا جو پیام تھا

ایتام نے حضور میں آکر یہ عرض کی — یہ چیز ہی ہے کیا کہ جو یہ اہتمام تھا
یہ ہدیۂ حقیر پذیرا کریں حضورؐ! — اللہ اس زمین کا یہ احترام تھا

لیکن حضورؐ نے نہ گوارا کیا اسے
منّت کشی سے آپ کو پرہیز تام تھا

احسان اور وہ بھی یتیمانِ زار کا
بالکل خلافِ طبعِ رسولِؐ انام تھا

بارہ ہزار سکۂ رائج عطا کئے
یہ تھا وہ خلق جس سے مخالف بھی رام تھا

سامان جو ضرور ہیں تعمیر کے لئے
اب ان کی فکر مشغلۂ صبح و شام تھا

مزدور کی تلاش بھی تھی سنگ و گل کی بھی
ازبسکہ جلد بننے کا خاص اہتمام تھا

انصارِ پاک اور مہاجر تھے جس قدر
مزدور بن گئے کہ خدا کا یہ کام تھا

اک اور نفسِ پاک بھی ان سب کا تھا شریک
جو آب و گل کے شغل میں بھی شاد کام تھا

کندھوں پہ اپنے لادکے لاتا تھا سنگ و خشت
سینہ غبارِ خاک سے سب گرد فام تھا

سمجھے کچھ آپ، کون تھا، انکا شریکِ حال
یہ خود وجودِ پاک رسولِؐ انام تھا

جو وجہ آفرینشِ افلاک و عرش ہے
جس کا کہ جبرئیلؑ بھی ادنیٰ غلام تھا

صلوٰ علی النبی واصحابہ الکرام
اس نظم مختصر کا یہ مسک الختام تھا

ایک خاتون کی آزادانہ گستاخی

اور

رسول اللہ صلعم کا حلم اور عفو

ہند تھی پردہ نشینِ حرمِ بوسفیاں — لقبِ ہند جگر خوار سے جو ہی مشہور

بارگاہِ نبوی میں وہ ہوئی جب حاضر — اس ارادے سے کہ ہو داخلِ اربابِ حضور

عرض کی خدمتِ اقدس میں کہ اے ختمِ رسل — دینِ اسلام ہے مجھکو بہ دل و جان منظور

آپ ہم پردہ نشینوں سے جو بیعت لیں گے — کون سے کام ہیں جن کا کہ ہے کرنا ہے ضرور

آپ نے لطف و عنایت سے یہ ارشاد کیا — پہلی یہ بات کہ ہو شائبۂ شرک سے دور

دوسری یہ کہ نبوت کا ہے لازم اقرار — بولی ان باتوں سے انکار نہیں مجھ کو حضور

پھر یہ ارشاد ہوا منع ہے اولاد کا قتل — اس شقاوت سے ہر اک شخص کو بچنا ہے ضرور

عرض کی اس نے کہ اے شمعِ شبستانِ رسل — یہ وہ موقع ہے کہ عاجز ہے یہاں فہم و شعور

میں نے اولاد کو پالا تھا بڑی محنت سے — میں انھیں آنکھ میں رکھتی تھی کہ تھے آنکھ کا نور

بدر میں قتل انھیں حضرتِ والا نے کیا — ہم سے کیا عہد اب اس بات کا لیتے ہیں حضور

گرچہ یہ سوءِ ادب تھا غلطی پر مبنی — گرچہ یہ بات تھی خود شیوۂ انصاف سے دور

اس کی اولاد نے خود جنگ میں کی تھی سبقت — لڑکے مارا کوئی جائے تو یہ کس کا ہے قصور

لیکن آزادیِ افکار تھی ازبسکہ پسند

آپ نے فرطِ کرم سے اُسے رکھا معذور

اہلِ بیتِ رسول صلعم کی زندگی

(علامہ شبلی مرحوم کی آخری نظم)

افلاس سے تھا سیدۂ پاک کا یہ حال
گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا!

گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں
چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا

سینہ پہ مشک بھر کے جو لاتی تھیں بار بار
گو نور سے بھرا تھا مگر نیل فام تھا

اٹ جاتا تھا لباسِ مبارک غبار سے
جھاڑو کا مشغلہ بھی جو ہر صبح و شام تھا

آخر گئیں جنابِ رسولِ خدا کے پاس
یہ بھی کچھ اتفاق کہ واں اذنِ عام تھا

محرم نہ تھے جو لوگ تو کچھ کر سکیں نہ عرض
واپس گئیں کہ پاسِ حیا کا مقام تھا

پھر جب گئیں دوبارہ تو پوچھا حضور نے
کل کس لئے تم آئی تھیں کیا خاص کام تھا

غیرت یہ تھی کہ اب بھی نہ کچھ منھ سے کہہ سکیں
(حیدر) نے انکے منھ سے کہا جو پیام تھا

ارشاد یہ ہوا کہ غریبانِ بے وطن
جن کا کہ صفۂ نبوی میں قیام تھا

میں ان کے بندوبست سے فارغ نہیں ہنوز
ہر چند اس میں خاص مجھے اہتمام تھا

جو جو مصیبتیں کہ اب ان پر گذرتی ہیں
میں ان کا ذمہ دار ہوں میرا یہ کام تھا

کچھ تم سے بھی زیادہ مقدم ہے ان کا حق
جن کو کہ بھوک پیاس سے سونا حرام تھا

خاموش ہو کے سیدۂ پاک رہ گئیں
جرأت نہ کر سکیں کہ ادب کا مقام تھا

یوں کی ہے اہلِ بیتِ مطہر نے زندگی
یہ ماجرائے دخترِ خیر الانام تھا

ایثار کی اعلیٰ ترین نظیر

کافروں نے یہ کیا جنگِ احد میں مشہور
کہ پیمبرؐ بھی ہوئے کشتۂ شمشیرِ دودم

ہو کے مشہور مدینہ میں جو پہنچی یہ خبر
ہر گلی کوچہ تھا ماتم کدۂ حسرت و غم

ہو کے بیتاب گھروں سے نکل آئے باہر
کودک و پیر و جوان و خدم و خیل و حشم

وہ بھی نکلیں کہ جو تھیں پردہ نشینانِ عفاف
جن میں تھیں سیدۂ پاک بھی با دیدۂ نم

ایک خاتون کہ انصار انکو نام سے تھیں
سخت مضطر تھیں نہ تھے ہوش و حواس انکے بہم

موقعِ جنگ پہ پہنچیں تو یہ لوگوں نے کہا
کیا کہیں تجھ سے کہ کہتے ہوئے شرماتے ہیں ہم

تیرے بھائی نے لڑائی میں شہادت پائی
تیرے والد بھی ہوئے کشتۂ شمشیرِ ستم

سب سے بڑھکر یہ کہ شوہر بھی ہوا تیرا شہید
گھر کا گھر صاف ہوا، ٹوٹ پڑا کوہِ الم

اس عفیفہ نے یہ سب سن کے کہا تو یہ کہا
یہ تو بتلاؤ کہ کیسے ہیں شہنشاہِ امم!

سب نے دی اسکو بشارت کہ سلامت ہیں حضورؐ
گرچہ زخمی ہیں سر و سینہ و پہلو و شکم

بڑھ کے اس نے رخِ اقدس کو جو دیکھا تو کہا
تو سلامت ہے تو پھر ہیچ ہے سب رنج و الم

میں بھی، اور باپ بھی، شوہر بھی، برادر بھی فدا
اے شہِ دیں ترے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

مساواتِ اسلام

بدر میں معرکہ آرا جو ہوا لشکرِ کفر — عتبہ ابن ربیعہ تھا امیر العسکر
سب سے پہلے وہی میدان میں بڑھا تیغ بکف — ساتھ اک بھائی تھا اور بھائی کے پہلو میں پسر
اس طرح اس نے مبارز طلبی کی پہلے — مردِ میداں کوئی تم میں ہو تو نکلے باہر
سن کے یہ لشکرِ اسلام سے نکلے پیہم — تین جانباز کہ ایک ایک تھا اس کا ہمسر
سامنے آئے جو یہ لوگ تو عتبہ نے کہا — کس قبیلہ سے ہو کیا ہے نسب جدّ و پدر
بولے ہم وہ ہیں کہ ہے نام ہمارا انصار — ہم میں شیدائی اسلام ہے ہر فردِ بشر
جاں نثارانِ رسولِ عربی ہیں ہم لوگ — اک اشارہ ہو تو ہم کاٹ کے رکھدیتے ہیں سر
بولا عتبہ کہ بجا کہتے ہو جو کہتے ہو — مگر افسوس کہ مغرور ہے اولادِ مضر
تم سے لڑنا تو ہمارے لئے ہے مایۂ عار — کہ نہیں تیغِ قریشی کے سزاوار یہ سر

کہہ کے یہ اس نے کیا سرورِ عالم سے خطاب — اے محمدؐ یہ نہیں شیوۂ اربابِ ہنر
جنگ ناجنس سے معذور ہیں ہم آلِ قریش — بھیج ان کو جو ہوں رتبہ میں ہمارے ہمسر
آپ کے حکم سے انصار پھر آئے صف میں — حمزہؓ و حیدرِ کرار نے لی تیغ و سپر
ان سے عتبہ نے جو پوچھا نسب و نام و نشاں — بولے یہ لوگ کہ ہاشم کے ہیں ہم لختِ جگر

بولا عتبہ کہ نہیں جنگ سے اب ہم کو گریز
آؤ اب تیغِ قریشی کے دکھائیں جوہر

یا یہ حالت تھی کہ تلوار بھی تھی طالبِ کفو
یا مساوات کا اسلام کے پھیلا یہ اثر

بارگاہِ نبوی کے جو مؤذن تھے (بلالؓ)
کر چکے تھے جو غلامی میں کئی سال بسر

جب یہ چاہا کہ کریں عقد مدینہ میں کہیں
جا کے انصار و مہاجر سے کہا یہ کھل کر

میں غلام حبشی اور حبشی زادہ بھی ہوں
یہ بھی سن لو کہ مرے پاس نہیں دولت و زر

ان فضائل پہ مجھے خواہشِ تزویج بھی ہے
ہے کوئی جسکو نہ ہو میری قرابت سے حذر

گردنیں جھک کے یہ کہتی تھیں کہ "دل سے منظور"
جس طرف اس حبشی زادہ کی اٹھتی تھی نظر!!

عہدِ فاروق میں جسدن کہ ہوئی ان کی وفات
یہ کہا حضرتِ فاروقؓ نے با دیدۂ تر!!

اٹھ گیا آج زمانے سے ہمارا آقا
اٹھ گیا آج نقیبِ حشمِ پیغمبر!

خلافتِ فاروقی کا ایک واقعہ

عام الرمادہ کہتے ہیں، جسکو عرب میں لوگ
عہدِ خلافتِ عمرؓ کا وہ سال تھا!

اس سال قحط عام تھا ایسا کہ ملک میں
لوگوں کو بھوک پیاس سے جینا محال تھا

پانی کی ایک بوند نہ ٹپکی تھی ابر سے
ہر خاص و عام سخت پراگندہ حال تھا

اعراب کی بسر خسراتِ زمیں پہ تھی — سب اُٹھ گیا جو فرقِ حرام و حلال تھا

تشویش سب سے بڑھ کے جنابِ عمرؓ کو تھی — ہر دم اسی کی فکر اسی کا خیال تھا

تدبیر لاکھ کی تھی مگر رُک سکا نہ قحط — گو انتظامِ ملک میں ان کو کمال تھا

معمول تھا جنابِ عمرؓ کا کہ متصل — کرتے تھے گشت رات کو سونا محال تھا

اک دن کا واقعہ ہے کہ پہنچے جو دشت میں — کوسوں تلک زمین پہ خیموں کا جال تھا

بچے کئی تھے ایک ضعیفہ کی گود میں — جن میں کوئی بڑا تھا کوئی خرد سال تھا

دیکھا جو اس کو یہ، کہ پکاتی ہے کوئی چیز — جاتا رہا جو طبعِ حزیں میں ملال تھا

سمجھے، کہ اب وہ ملک کی حالت نہیں رہی — کم ہو چلا ہے، قحط کا جو اشتعال تھا

پوچھا خود اس سے جا کے تو رونے لگی کہ "آہ — کیا آپ کو غذا کا بھی یاں احتمال تھا

بچے یہ تین دن سے تڑپتے ہیں خاک پر — میں کیا کہوں زبان سے اِنکا جو حال تھا

مجبور ہو کے ان کے بہلنے کے واسطے — پانی چڑھا دیا ہے یہ اس کا اُبال تھا

ان سے یہ کہدیا ہے کہ اب مطمئن رہو — کھانا یہ پک رہا ہے، اسی کا خیال تھا

بے اختیار رونے لگے حضرتِ عمرؓ — بولے کہ "یہ مرے ہی کیے کا وبال تھا

جو کچھ کہ ہے یہ سب ہے مری شامتِ عمل — ازبس گناہگار مرا بال بال تھا"

بازار جا کے لائے سب اسبابِ آب و ناں — جو زخمِ قحط کا سببِ اندمال تھا

چولھے کے پاس بیٹھ کے خود پھونکتے تھے آگ — چہرہ تمام آگ کی گرمی سے لال تھا

بچوں نے پیٹ بھر کے جو کھایا تو کھل اٹھے — ایک ایک اب تو فرطِ خوشی سے نہال تھا

تھی وہ زنِ ضعیف سراپا زبانِ شکر — یاں حضرتِ عمرؓ کو وہی انفعال تھا

عہدِ عمرؓ کو یہ جو ملا تجھ سے چھین کر — جو کچھ گذر رہا ہے یہ اس کا وبال تھا

عدل فاروقی کا ایک نمونہ

ایک دن حضرت فاروق ؓ نے منبر پہ کہا ۔۔۔ "میں تمھیں حکم جو کچھ دوں تو کرو گے منظور"

ایک نے اٹھ کے کہا یہ کہ "نہ مانیں گے کبھی ۔۔۔ کہ ترے عدل میں ہم کو نظر آتا ہے فتور

چادریں مال غنیمت میں جو اب کے آئیں ۔۔۔ صحن مسجد میں وہ تقسیم ہوئیں سب کے حضور

ان میں ہر ایک کے حصہ میں فقط ایک آئی ۔۔۔ تھا تمھارا بھی وہی حق کہ یہی ہے دستور

اب جو یہ جسم پہ تیرے نظر آتا ہے لباس ۔۔۔ یہ اسی لوٹ کی چادر سے بنا ہوگا ضرور

مختصر تھی وہ ردا اور ترا قد ہے دراز ۔۔۔ ایک چادر میں ترا جسم نہ ہوگا مستور

اپنے حصہ سے زیادہ جو لیا تو نے تو اب ۔۔۔ تو خلافت کے نہ قابل ہے نہ ہم ہیں مامور"

گرچہ وہ حد مناسب سے بڑھا جاتا تھا ۔۔۔ سب کے سب مہر بہ لب تھے چہ اناث و چہ ذکور

روک دے کوئی کسی کو یہ نہ رکھتا تھا مجال ۔۔۔ نشۂ عدل و مساوات سے تھے سب مخمور

اپنے فرزند سے فاروق معظم ؓ نے کہا ۔۔۔ تم کو ہے حالت اصلی کی حقیقت پہ عبور

تمھیں دے سکتے ہو اس کا مری جانب سے جواب ۔۔۔ کہ نہ پکڑے مجھے محشر میں مرا رب غفور"

بولے یہ ابن عمر ؓ سب سے مخاطب ہو کر ۔۔۔ "اس میں کچھ والد ماجد کا نہیں جرم و قصور

ایک چادر میں جو پورا نہ ہوا اُن کا لباس
کر سکی اس کو گوارا نہ مری طبعِ غیور
اپنے حصّہ کی بھی میں نے انھیں چادر دیدی
واقعہ کی یہ حقیقت ہے، کہ جو تھی مستور"

نکتہ چیں نے یہ کہا اٹھ کے کہ ہاں اے فاروقؓ
حکم دے ہم کو، کہ اب ہم اُسے مانیں گے ضرور"

اظہار و قبولِ حق

وارثِ عدلِ پیمبر عمرؓ ابن الخطاب
ہیچ تھی جن کے لئے منزلتِ تاج و سریر
مجمعِ عام میں لوگوں سے انھوں نے یہ کہا
"مہر باندھو نہ زیادہ کہ ہے یہ بھی تبذیر
جس قدر تم کو ہو مقدور وہیں تک باندھو
حکم یہ عام ہے سب کو امرا ہوں کہ فقیر"
ایک بڑھیا نے وہیں ٹوک کے فوراً یہ کہا
"تجھ کو کیا حق ہے، جو تو کرتا ہے ایسی تقریر
صاف قرآن میں قنطار کا لفظ آیا ہے
تجھ کو کیا حق ہے، کہ اس لفظ کی کردے تغییر؟
لاکھ تک بھی ہو تو کہہ سکتے ہیں اس کو قنطار
تھا یہ اک وزن، کہ اس وزن کی یہ ہے تعبیر"

سرنگوں ہو کے کہا حضرت فاروقؓ نے "آہ!
میں نہ تھا اس سے جو واقف تو یہ میری تقصیر!"

مدتوں حضرتِ عباسؓ بھی تھے شاملِ کفر
کم سے کم یہ کہ رسالت پہ نہ تھا ان کو یقین

بدر میں آکے لڑے اور گرفتار ہوئے
بسکہ تقدیر میں تھی خانۂ زنداں کی زمیں

قیدیوں کے لئے جو گھر کہ ہوا تھا تیار
اتفاقات سے تھا خانۂ مسجد کے قریں

رات کو حضرتِ عباسؓ کراہے اکثر
قید کرتے ہوئے لوگوں نے جو مشکیں تھیں کسیں

دیر تک سرورِ عالمؐ کو رہی بے خوابی
کروٹیں لیتے تھے اور نیند نہ آتی تھی قریں

وجہ پوچھی جو صحابہؓ نے تو یہ فرمایا
"آتی ہے کان میں عباسؓ کی آوازِ حزیں"

جب سنا یہ تو وہیں کھول دیئے ہاتھ ان کے
چین سے حضرتِ عباسؓ نے راتیں کاٹیں

تھا انہی حضرتِ عباسؓ کا پوتا (منصور)
جو کہ ایوانِ خلافت میں ہوا تخت نشیں

ایک دن حکم دیا اس نے کہ "اولادِ رسولؐ
ایک جا جمع کئے جائیں، جو مل جائیں کہیں"

پھر دیا حکم کہ "ان سب کو پنہا کر زنجیر
کہدو ان سے کہ بنیں خانۂ زنداں کے مکیں"

ایک دن سیر کو اس شان سے نکلا منصور
پا بہ زنجیر تھے سادات یسار اور یمیں

ساتھ ساتھ آتے تھے پیدل جگر و جانِ رسولؐ
اور منصور تھا زیبِ حرمِ خانۂ زیں

ایک نے مجمعِ سادات سے بڑھ کر یہ کہا
گرچہ اس لطف کے مشکور ہیں ہم خاک نشیں

غزوۂ بدر میں لیکن جو کیا ہم نے سلوک
وہ تو کچھ اور تھا ہے یاد بھی تم کو کہ نہیں

نظامِ حکومتِ اسلام

جب ولی عہد ہوا تختِ حکومت کا یزید
عاملِ یثرب و بطحا کو یہ پہونچے احکام

کہ ولی عہد کا بھی اب سے پڑھے نام ضرور
خطبہ پڑھتا ہے حریمِ نبوی میں جو امام

وقت آیا تو چڑھا پایۂ منبر پہ خطیب
اور کہا یہ کہ یزید اب ہے امیرِ اسلام

یہ نئی بات نہیں ہے کہ ابو بکرؓ و عمرؓ
جانشیں کر گئے جب موت کا پہنچا پیغام

اٹھ کے فرزند ابو بکرؓ نے فوراً یہ کہا
سر بسر کذب ہے یہ اے خلفِ نسلِ لئام

جھوٹ ہے یہ کہ ہے یہ سنتِ بو بکرؓ و عمرؓ
ہاں مگر قیصر و کسریٰ کی ہے یہ سنتِ عام

اپنے بیٹے کو بنایا تھا خلیفہ کس نے
ایسی بدعت کا نہیں مذہبِ اسلام میں نام

یہ طریقہ متوارث ہے تو کفار میں ہے
ورنہ اسلام ہے اک مجلسِ شوریٰ کا نظام

شانِ اسلام ہے شخصیتِ ذاتی سے بعید
شرع میں سلطنتِ خاص ہے ممنوع و حرام

اس سے بھی قطع نظر نسلِ عرب ہیں ہم لوگ
وہ کوئی اور ہیں ہوتے ہیں جو شاہوں کے غلام"

ہمارا طرزِ حکومت

کبھی ہم نے بھی کی تھی حکمرانی ان ممالک پر | مگر وہ حکمرانی جس کا سکہ جان و دل پر تھا

قرابت راجگانِ ہند سے (اکبر) نے جب چاہی | کہ یہ رشتہ عروسِ کشور آرائی کا زیور تھا
تو خود فرماندہِ (جیپور) نے نسبت کی خواہش کی | اگرچہ آپ بھی وہ صاحبِ دیہیم و افسر تھا
ولی عہدِ حکومت اور خود شاہنشہِ اکبر | گئے اَمبیر تک جو تخت گاہِ ملک و کشور تھا
اُدھر راجہ کی نور دیدہ گھر میں حجلہ آرا تھی | ادھر شہزادے پر چترِ عروسی سایہ گستر تھا
دلہن کو گھر سے منزل گاہ تک اس شان سے لائے | کہ کوسوں تک زمیں پر فرشِ دیبائے مشجر تھا
دلہن کی پالکی خود اپنے کندھوں پر جو لائے تھے | وہ شاہنشاہِ اکبر اور جہانگیر ابن اکبر تھا

یہی ہیں وہ شمیم انگیزیاں عطرِ محبت کی | کہ جن سے بوستانِ ہند برسوں تک معطر تھا

تمھیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

عدلِ جہانگیری

قصرِ شاہی میں کہ ممکن نہیں غیروں کا گزر
ایک دن نور جہاں بام پہ تھی جلوہ فگن

کوئی شامت زدہ رہ گیر اُدھر آ نکلا
گرچہ تھی قصر میں ہر چار طرف سے قدغن

غیرتِ حسن سے بیگم نے طپنچہ مارا
خاک پر ڈھیر تھا اک کشتۂ بے گور و کفن

ساتھ ہی شاہِ جہانگیر کو پہونچی جو خبر
غیظ سے آ گئی ابروے عدالت پہ شکن

حکم بھیجا کہ کنیزانِ شبستانِ شہی
جا کے پوچھ آئیں کہ سچ یا کہ غلط ہے یہ سخن

نخوتِ حسن سے بیگم نے بصد ناز کہا
"میری جانب سے کرو عرض بہ آئینِ حسن

ہاں مجھے واقعۂ قتل سے انکار نہیں
مجھ سے ناموسِ حیا نے یہ کہا تھا کہ "بزن"

اس کی گستاخ نگاہی نے کیا اس کو ہلاک
کشورِ حسن میں جاری ہے یہی شرعِ کہن"

مفتیِ دیں سے جہانگیر نے فتویٰ پوچھا
کہ شریعت میں کسی کو نہیں کچھ جائے سخن

مفتیِ دین نے بےخوف و خطر صاف کہا
"شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑا دو گردن"

لوگ دربار میں اس حکم سے تھرا اُٹھے
پر جہانگیر کے ابرو پہ نہ بل تھا نہ شکن

ترکنوں کو یہ دیا حکم کہ "اندر جا کر
پھر اسی طرح اُسے کھینچ کے باہر لائیں
پہلے بیگم کو کریں بستۂ زنجیر و رسن
اور جلادوں کو دیں حکم کہ "ہاں تیغ بزن"

یہ وہی نور جہاں ہے کہ حقیقت میں یہی
تھی جہانگیر کے پردہ میں شہنشاہِ زمن
اس کی پیشانیِ نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ
جا کے بنجاتی تھی اوراقِ حکومت پہ شکن

اب نہ وہ نور جہاں ہے، نہ وہ اندازِ غرور
نہ وہ غمزے ہیں، نہ وہ عربدۂ صبر شکن!
اب وہی پانوں ہر اک گام پہ تھراتے ہیں
جن کی رفتار سے پامال تھے مرغانِ چمن

ایک مجرم ہے کہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع
ایک بیکس ہے کہ جس کا نہ کوئی گھر نہ وطن!

خدمتِ شاہ میں بیگم نے یہ بھیجا پیغام
خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امرِ حسن"
مفتیِ شرع سے پھر شاہ نے فتویٰ پوچھا
بولے جائز ہے، رضامند ہوں گر بچۂ و زن"

وارثوں کو جو دیے لاکھ درم بیگم نے
سب نے دربار میں کی عرض کہ "اے شاہِ زمن
ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص
قتل کا حکم جو رک جائے تو ہے مستحسن"

ہو چکا جب کہ شہنشاہ کو پورا یہ یقین
کہ نہیں اس میں کوئی شائبۂ حیلہ و فن
اٹھ کے دربار سے آہستہ چلا سوئے حرم
تھی جہاں نور جہاں معتکفِ بیتِ حزن

دفعۃً پانوں پہ بیگم کے گرا اور یہ کہا
"تو اگر کشتہ شدی، آہ چہ می کردم من"؟

اسلام کے تنزل کا اصلی سبب

لوگ کہتے ہیں کہ یہ بات ہے امرِ صریح
کہ زمانہ میں کہیں عزتِ اسلام نہیں

آپ جائینگے جہاں قوم کو پائینگے ذلیل
اس میں تخصیصِ عراق و عرب و شام نہیں

یہ بھی ظاہر ہے کہ ہیں مختلف الحال یہ لوگ
کوئی چیز ان میں جو ہو مشترکِ عام نہیں

ایشیائی ہے اگر یہ، تو وہ ہے افریقی
اور کوئی رابطۂ نامہ و پیغام نہیں

لالہ رُخ یہ ہے، تو زنگی و سیہ فام ہے وہ
یہ سمن بر ہے، وہ موزون و خوش اندام نہیں

اس نے گہوارۂ راحت میں بسر کی ہے عمر
وہ کبھی خوگرِ آسایش و آر ام نہیں

وہ ازل سے ہے کمند افگن و شمشیر نواز
اس کو جز عیش، کسی چیز سے کچھ کام نہیں

خوان و ایوان سے بھی سیری نہیں ہوتی اسکو
اسکو گر نانِ جویں بھی ہو تو ابرام نہیں

اس نے یورپ کے مدارس میں جو سیکھے ہیں علوم
وہ ابھی ابجدِ تعلیم سے بھی ر ام نہیں

اس قدر فرق و تفاوت پہ بھی ہے عام یہ بات
قوم کا دفترِ عزت میں کہیں نام نہیں

پس اگر غور سے دیکھو، تو بجز مذہب و دیں
ہم مسلمانوں میں کوئی صفتِ عام نہیں

ان اصولوں کی بنا پر یہ نتیجہ ہے صریح
سببِ پستیِ اسلام، جز اسلام نہیں

ان مسائل میں ہے کچھ ژرف نگاہی درکار
یہ حقائق ہیں تماشائے لبِ بام نہیں

غور کرنے کے لئے فکر و تعمق ہے ضرور
منزلِ خاص ہے یہ رہ گذرِ عام نہیں

بحث ما فیہ میں پہلی غلطی یہ ہے، کہ آپ
جس کو اسلام سمجھتے ہیں وہ اسلام نہیں

آپ کھانے کو بنا دیتے ہیں پہلے مسموم
پھر یہ کہتے ہیں، غذا موجب اسقام نہیں

اعتقادات میں ہی سب سے مقدم توحید
آپ اس وصف کو ڈھونڈھیں تو کہیں نام نہیں

کون ہی شائبۂ شرک سے خالی اس وقت
کون ہی جس پہ فریب ہوس خام نہیں

آستانوں کی زیارت کے لئے شدّ رحال
اس میں کیا شانِ پرستاریِ اصنام نہیں

کیجئے مسئلۂ "شرک نبوت" پہ جو غور
کفر میں بھی یہ جہانگیریِ اوہام نہیں

اب عمل پر جو نظر کیجئے آئے گا نظر
کہ کسی ملک میں پابندیِ احکام نہیں

اغنیا کی ہی یہ حالت، کہ نہیں ہی وہ رئیس
جس کے چہرے پہ فروغ مے گلفام نہیں

نصِ قرآن سے مسلمان ہیں بھائی بھائی
اس اخوت میں خصوصیت اعمام نہیں

یاں یہ حالت ہی کہ بھائی کا ہی بھائی دشمن
کون سا گھر ہے جہاں یہ روشِ عام نہیں

نہ کہیں صدق و دیانت ہی نہ پابندیِ عہد
دل میں ناصاف زبانوں میں جو دشنام نہیں

آیت فاعتبروا پڑھتے ہیں ہر روز مگر
علما کو خبر گردشِ ایام نہیں

الغرض عام ہی وہ چیز جو بے دینی ہے
صاف یہ بات ہی دھوکا نہیں ابہام نہیں

ان حقایق کی بنا پر سبب پستی قوم
ترک پابندیِ اسلام ہے اسلام نہیں

خلیفہ عمر بن عبد العزیز کا انصاف

پسرِ عبدِ عزیزِ اموی
عدل میں ثانی ابن الخطاب رض

جب ملا تختِ خلافت ان کو
ہو گیا گلشنِ گیتی، شاداب

ایک شب گھر سے چلے بہرِ نماز
پڑ گیا جب رخِ عالم پہ نقاب

کوئی آوارہ وطن تند مزاج
صحنِ مسجد میں تھا آلودۂ خواب

پاؤں کا اُن کے ٹھوکا جو لگا
جاگ اٹھا اور کیا ان سے خطاب

"خیر ہے؟ کیا کوئی مجنوں ہے تو؟
یا کہ کچھ ہے تری آنکھوں پہ حجاب"

ہنس کے فرمایا کہ "مجنون نہیں
کچھ نہیں مجھ میں جنوں کے اسباب

ہاں مگر ہو گئی مجھ سے تقصیر
آپ سے عفو کا طالب ہوں جناب"

چوبداروں نے کیا اس کو اسیر
چاہتے یہ تھے کہ دیں اسکو جواب

آپ نے روک دیا ان کو وہیں
پھر کیا ان سے یہ آہستہ خطاب

اُس نے اک بات فقط پوچھی تھی
جو مناسب تھا دیا میں نے جواب

بات قطعی تو نہیں اس نے کہی
پوچھنا کچھ نہیں شایانِ عتاب

اتنی سی بات پہ یہ جوشِ غضب
اتنی سی بات پہ یہ خشم و عتاب

بیکسوں کو میں ستاؤں کیوں کر
مجھ کو دینا ہے قیامت میں جواب"

شغلِ تکفیر

اک مولوی صاحب سے کہا میں نے کہ کیا آپ
کچھ حالتِ یورپ سے خبردار نہیں ہیں

آمادۂ اسلام ہیں لندن میں ہزاروں
ہر چند ابھی مائلِ اظہار نہیں ہیں

تقلید کے پھندوں سے ہوئے جاتے ہیں آزاد
وہ لوگ بھی جو داخلِ احرار نہیں ہیں

جو نام سے اسلام کے ہو جاتے تھے برہم
ان میں بھی تعصب کے وہ آثار نہیں ہیں

افسوس مگر یہ ہے کہ واعظ نہیں پیدا
یا ہیں تو بقول آپکے دیندار نہیں ہیں

کیا آپکے زمرہ میں کسی کو نہیں یہ درد
کیا آپ بھی اس کے لئے تیار نہیں ہیں

جھلا کے کہا یہ کہ "یہ کیا سوء ادب ہے
کہتے ہو وہ باتیں جو سزاوار نہیں ہیں

کرتے ہیں شب و روز مسلمانوں کی تکفیر
بیٹھے ہوئے کچھ ہم بھی تو بیکار نہیں ہیں"

مذہب یا سیاست

تم کسی قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو
دو ہی باتیں ہیں کہ جن پر ہے ترقی کا مدار

یا کوئی جذبۂ دینی تھا کہ جس نے دم میں
کر دیا ذرۂ افسردہ کو ہمرنگِ شرار

ہے یہ وہ قوتِ پر زور کہ جس کی ٹکرار
سنگِ خارا کو بنا دیتی ہے اک مشتِ غبار

اس کی زد کھا کے لرز جاتی ہے بنیادِ زمیں
اس سے ٹکرا کے بکھر جاتے ہیں اوراقِ دیار

یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے بچے
کھیلتے جاتے تھے ایوانگہِ کسریٰ میں شکار

وہ الٹ دیتے تھے دنیا کا مرقع دم میں
جن کے ہاتھوں میں رہا کرتی تھی اونٹوں کی مہار

اس کی برکت تھی کہ صحرائے حجازی کی سموم
بن گئی دہر میں جا کر چمن آرائے بہار

یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے رہزن
فاش کرنے لگے جبریلِ امیں کے اسرار

یا کوئی جذبۂ ملک و وطن تھا جس نے
کر دیئے دم میں قوائے عملی سب بیدار

ہے اسی مے سے یہ سرمستیِ احرارِ وطن
ہے اسی نشہ سے یہ گرمیِ ہنگامۂ کار

آپ دونوں سو کئے دیتے ہیں ہم کو محروم
نہ سیاست ہی نہ ناموسِ شریعت کا وقار

مدتوں بحثِ سیاست کی اجازت ہی نہ تھی
کہ وفاداریِ مسلم کا تھا یہ خاص شعار

اب اجازت ہی مگر دائرۂ بحث ہے یہ
کہ گورنمنٹ سے اس بات کے ہوں عرض گذار

ہم کو پامال کئے دیتے ہیں ابنائے وطن
ڈر ہے پس جائے نہ یہ فرقۂ اخلاص شعار

یہ بھی اک گونہ شکایت ہی غلاموں کو ضرور
کہ مناصب میں ہے کم حلقہ بگوشوں کا شمار

اب رہا جذبۂ دینی تو وہ اس طرح مٹا
کہ ہمیں آپ ہی آتا ہے اب اس نام سے عار

وضع میں طرز میں اخلاق میں سیرت میں کہیں
نظر آتے نہیں کچھ حرمتِ دیں کے آثار

آپنے ہم کو سکھائے ہیں جو یورپ کے علوم
اس ضرورت سے نہیں قوم کو ہرگز انکار

بحث یہ ہے کہ وہ اس طرز سے بھی ممکن تھا
کہ نہ گھٹتا کبھی ناموسِ شریعت کا وقار

ہم نے پہلے بھی تو اغیار کے سیکھے تھے علوم
ہم نے پہلے بھی تو اس نشہ کا دیکھا ہے خمار

نام لیتے تھے ارسطو کا ادب سے ہر چند
تھے فلاطونِ الٰہی کے بھی گوشکر گذار

جانتے تھے مگر اس بات کو بھی اہلِ نظر
کہ حریفوں کو نہیں انجمنِ خاص میں بار

یعنی یہ بادۂ عرفاں کے نہیں ذوق شناس
بزمِ اسرار کے یہ لوگ نہیں بادہ گسار

آج ہر بات میں ہے شانِ تفرنج پیدا
آج ہر رنگ میں یورپ کے نمایاں ہیں شعار

ہیں شریعت کے مسائل بھی وہیں تک محدود
کہ جہاں تک انھیں معقول بتائیں اغیار

خواتینِ عرب
کا
ثبات و استقلال

(۱)

مسند آرائے خلافت جو ہوئے "ابن زبیرؓ"
سب نے بیعت کیلئے ہاتھ بڑھائے یکبار

"ابن مروان" نے "حجاج" کو بھیجا پئے جنگ
جسکی تقدیر میں مرغانِ حرم کا تھا شکار

حرمِ کعبہ میں محصور ہوئے "ابن زبیرؓ"
فوجِ بے دیں نے کیا کعبۂ ملت کا حصار

دامنِ عرش ہوا جاتا تھا آلودۂ گرد
بارشِ سنگ سے اٹھتا تھا جو رہ رہ کے غبار

تھا جو سامانِ رسد چار طرف سے مسدود
ہر گلی کوچہ بنا جاتا تھا اک گنجِ مزار

جب یہ دیکھا کہ کوئی ناصر و یاور نہ رہا
ماں کی خدمت میں گئے "ابن زبیرؓ" آخر کار

جا کے کی عرض کہ "اے اختِ حریمِ نبویؐ
نظر آتے نہیں اب حرمتِ دیں کے آثار

آپ فرمائیے اب آپ کا ارشاد ہے کیا؟
کہ میں ہوں آپ کا اک بندۂ فرمانبردار

صلح کر لوں، کہ چلا جاؤں حرم سے باہر
یا یہیں رہ کے اسی خاک پہ ہو جاؤں نثار"

بولی وہ پردہ نشینِ حرمِ سرِّ عفاف
"حق پہ گر تو ہے، تو پھر صلح ہے مستوجبِ عار

یہ زمیں ہے وہی قربان گہِ اسمٰعیل
فدیۂ نفس ہے خود دینِ خلیلی کا شعار"

ماں سے رخصت ہوئے یہ کہہ کے بہ آدابِ نیاز
"آپکے دودھ سے شرمندہ نہ ہوں گا زنہار"

پہلے ہی حملہ میں دشمن کی الٹ دیں فوجیں — جس طرف جاتے تھے یہ، ٹوٹتی جاتی تھی قطار
منجنیقوں سے برستے تھے جو پتھر پیہم — ایک پتھر نے کیا آکے سرو رخ کو فگار
خون ٹپکا جو قدم پر، تو کہا از رہِ فخر — "یہ ادا وہ ہے کہ ہم ہاشمیوں کا ہے شعار
اس گھرانے نے کبھی پشت پہ کھایا نہیں زخم — خون ٹپکے گا تو ٹپکے گا قدم پر ہر بار"
زخم کھا کھا کے لڑے جاتے تھے لیکن کب تک — آخرالامر گرے خاک پہ مجروح و نزار
لاش منگوا کے جو حجاج نے دیکھی تو کہا — "اس کو سولی پہ چڑھاؤ کہ یہ تھا قابلِ دار"
لاش لٹکی رہی سولی پہ کئی دن، لیکن — اُن کی ماں نے نہ کیا رنج و الم کا اظہار
اتفاقات سے اک دن جو اُدھر جا نکلیں — دیکھ کر لاش کو بے ساختہ بولیں یکبار
"ہو چکی دیر کہ منبر پہ کھڑا ہے یہ خطیب — اپنے مرکب سے اترتا نہیں اب بھی یہ سوار"

(۲)

حضرتِ ابن زبیرؓ بن عوام — جب ہوا اُن پہ خلافت کا مدار
کی مخالف نے چڑھائی اُن پہ — گرم تھا موت کا ہر سو بازار
ہو گئے لڑ کے پھر آخر کو شہید — لاش کو اُن کی چڑھایا سرِ دار
اُن کی ماں نے جو سُنی ان کی خبر — دل ہوا ان کا محبت سے فگار
لیکن از بسکہ طبیعت تھی غیور — نہ کیا رنج و الم کا اظہار
اتفاقاً جو ادھر جا نکلیں — کہ وہ موقع تھا سر راہ گذار
لاش بیٹے کی جو لٹکی دیکھی — منہ سے بے ساختہ نکلا یکبار

"اب بھی منبر سے نہ اترا یہ خطیب
اب بھی گھوڑے سے نہ اترا یہ سوار"

سیاسی نظمیں

شہر آشوبِ اسلام

ہنگامۂ طرابلس و بلقان

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اُٹھے گا دھواں کب تک

قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیئے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑینگی دھجیاں کب تک

مراکش جا چکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جاں کب تک

یہ سیلابِ بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اُسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

یہ سب ہیں رقصِ بسمل کا تماشا دیکھنے والے
یہ سیر ان کو دکھائیگا شہیدِ نیم جاں کب تک

یہ وہ ہیں، نالۂ مظلوم کی لَے جن کو بھاتی ہے
یہ راگ ان کو سنائے گا یتیمِ ناتواں کب تک

کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو!
یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک

یہ جوش انگیزئ طوفانِ بیداد و بلا تا کے؟
یہ لطف اندوزئ ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک

نگارستانِ خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی
تو ہم دکھلائیں تمکو زخمہائے خوں چکاں کب تک

یہ مانا گرمیِ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو؟
دکھائیں ہم تمھیں ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

یہ مانا قصۂ غم سے تمھارا جی بہلتا ہے
سنائیں تمکو اپنے دردِ دل کی داستاں کب تک

یہ مانا تمکو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمھاری کھیتیاں کب تک

عروسِ بخت کی خاطر تمھیں درکار ہے افشاں
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہونگے زر فشاں کب تک

کہاں تک لوگے ہم سے انتقامِ فتحِ ایوبی
دکھاؤگے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک

سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہیں ہم
مٹاؤگے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک

زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملت ہے
عزیزو! فکرِ فرزند و عیال و خان و ماں کب تک

خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ طیاریاں کیا ہیں؟
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھوگے تم یہ چیستاں کب تک

پرستارانِ خاکِ کعبہ دنیا سے اگر اٹھے
تو پھر یہ احترامِ سجدہ گاہِ قدسیاں کب تک

جو گونج اٹھے گا عالم شورِ ناقوسِ کلیسا سے
تو پھر یہ نغمۂ توحید و گلبانگِ اذاں کب تک

بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراقِ اسلامی
چلیں گی تند بادِ کفر کی یہ آندھیاں کب تک

کہیں اڑ کر نہ دامانِ حرم کو بھی یہ چھو آئے
غبارِ کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک

حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کے آشیاں کب تک

جو ہجرت کرکے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کب تک

خیر مقدم ڈاکٹر انصاری

ہندوستانی طبّی وفد جو جنگ بلقان میں ٹرکی بھیجا گیا تھا اس کی واپسی کے
وقت بمبئی میں یہ نظم پڑھی گئی تھی،

ادا کرتے ہیں ہم شکرِ جنابِ حضرتِ باری
کہ آئے خیریت سے ممبرانِ وفدِ انصاری

ہزاروں کوس جا کر بھائیوں کی تم نے خدمت کی
یہی تھا دردِ اسلامی یہی تھی رسمِ غمخواری

فراقِ ملک و ترکِ خانمان و دوریِ منزل
خدا کے فضل سے تم نے یہ کڑیاں جھیل لیں ساری

تمھارے روکنے کے واسطے ہنگامہ آرا تھے
صدائے نالہ ہائے درد و جوشِ گریہ وزاری

نگاہِ حسرت آلودِ عزیزاں کی سناں باری
فغانِ سینہ ریشانِ محبت کی شرر باری

مگر اک جذبۂ اسلام نے سب کو شکستیں دیں
کہ سب کو چھوڑ کر پہنچے وہاں با ایں گرانباری

جو سچ پوچھو تو تم انصار بھی ہو اور مہاجر بھی
کہ سب اہلِ وطن کو چھوڑ کر پہنچے پئے یاری

کسی کو خواب میں بھی یہ سعادت مل نہیں سکتی
مریضوں کیلئے وہ آپ کی شب ہائے بیداری

جو سچ پوچھو تو زیبا ہی تمھیں دعوائے آقائی
کہ تم نے کی ہے ترکانِ مجاہد کی پرستاری

تمھارا ناز اٹھائیں اہلِ ملت جس قدر کم ہے
کہ تم نے غازیانِ دیں کی کی ہے ناز برداری

تمھارے سامنے موتی کی لڑیاں پرسے کم ہیں
کہ دیکھ آئے ہو تم ترکی یتیموں کی گہرباری

تمھیں کچھ جاں نوازی ہائے اسلامی کو سمجھوگے
کہ تم دیکھ آئے ہو نصرانیوں کا طرزِ خونخواری

نہیں ہے سوز اسلامی کا گو نام و نشاں باقی
تمہارے دل میں ہیں کچھ درد کی چنگاریاں باقی

مسلمانوں کے تم نے طالعِ واژوں بھی دیکھے ہیں
نئے سب انقلابِ گردشِ گردوں بھی دیکھے ہیں

تمہارا دردِ دل سمجھیں گے کیا ہندوستاں والے
کہ تم نے وہ مظالم ہائے روز افزوں بھی دیکھے ہیں

یتیموں کے سنے ہیں نالہ ہائے جاں گزا تم نے
زنانِ بینوا کے چہرۂ محزوں بھی دیکھے ہیں

گھروں کو لوٹنے کے بعد زندوں کو جلا دینا
بلادِ مغربی کے یہ نئے قانوں بھی دیکھے ہیں

مسلمانوں کا قتلِ عام اور ترکوں کی بربادی
نتائج ہائے امیدِ گلیڈسٹوں بھی دیکھے ہیں

تمہیں نے غازیوں کے زخم پر ٹانکے لگائے ہیں
شہیدانِ وطن کے جامۂ پُرخوں بھی دیکھے ہیں

تمہاری چشمِ عبرت گیر خود ہم سے یہ کہتی ہے
کہ ہم نے وہ مصائب ہائے گوناگوں بھی دیکھے ہیں

لہو کی چادریں دیکھی ہیں رخسارِ شہیداں پر
زمیں پر پارہ ہائے سینۂ پرخوں بھی دیکھے ہیں

نگارآرائیاں دیکھی ہیں چشمِ گوہر افشاں کی
شہیدانِ وفا کے عارضِ گلگوں بھی دیکھے ہیں

تمہیں سے کچھ پتہ ملتا ہے شیدایانِ ملت کا
کہ تم نے شاہدِ اسلام کے مفتوں بھی دیکھے ہیں

جنونِ جوشِ اسلامی کوئی سمجھا تو تم سمجھے
کہ تم نے لیلیٔ اسلام کے مجنوں بھی دیکھے ہیں

سہارا ہے اگر امید کا اب بھی کوئی باقی
تو تم نے وہ رموزِ قوتِ مکنوں بھی دیکھے ہیں

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے
کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

دعائے کہنہ سالاں ہے اگر مقبولِ یزدانی
تو اب دستِ دعا ہے اور یہ شبلی نعمانی

سر آغا خاں کا خطاب ترکوں سے

(۱)

جنگ بلقان کے زمانہ میں سر آغا خاں نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں ترکوں کو یہ صلاح دی تھی کہ ان کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ سرزمین یورپ کو چھوڑ کر ایشیا چلے جائیں تاکہ وہ دولِ یورپ کے حملوں سے محفوظ رہیں، اس مضمون سے مسلمانوں میں بہت غصہ پیدا ہوا تھا، اور ان کے وقار کو بہت صدمہ پہنچا، ذیل میں اس کا طنزیہ جواب ہے،

گفت با ترک حضرتِ آغا — آنچہ گویم بگوشش درگیرید

بگذارید خاکِ یورپ را — دل ازیں مرز بوم، برگیرید

ایشیا مسکنِ قدیم شما است — باز آں خاک را مقر گیرید

دل بعید رمیدہ نتواں بست — یک تنکارِ شکستہ برگیرید

اسپ، گر زیرِ راں نمی آید — بگذارید و مادہ خر گیرید

کارِ پیشینۂ شما کشت است — مرغزارے و گاؤ نر گیرید

بانگِ توپ و تفنگ دردِ سر است — ناوک و خنجر و سپر گیرید

نوبتِ ریل و تلغراف گذشت — قاصد و پیک و نامہ برگیرید

کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد

ہرچہ گیرید، مختصر گیرید

(۲)

ترک سے حضرتِ آغا نے یہ ارشاد کیا — کیوں ہو بے فائدہ یورپ میں گرفتارِ الم؟
ایشیا میں اگر آجاؤ تو پھر تا بہ ابد — پاؤں پھیلا کے پڑے چین سے سوؤگے چہ غم؟
نظر آجائے گی بے کاریِ آلاتِ جدید — جب کہ تم وادیِ تاتار میں رکھوگے قدم
ریل یا تار کی پھر ہوگی نہ حاجت تم کو — ڈاک پہنچانے کو آجائیں گے مرغانِ حرم
خود ہی کہدوگے کہ بے کار ہیں سب تیر و تفنگ — نظر آئے گا جو تیر افگنیوں کا عالم
سلکِ بحری کی ادا دل سے اتر جائیگی — دیکھ لوگے جو کمندوں کا وہ پیچ اور وہ خم
فائدہ کیا ہے کہ تم ریل کا احسان اٹھاؤ؟ — آپ کا اسپ سبک سیر ہے کس بات میں کم؟
آپ صحرا میں چلائیں گے جو خشکی کا جہاز — پھر نہ کچھ بھاپ کی حاجت ہے نہ طوفاں کا غم
لطف جو بانگِ جرس میں ہے وہ سیٹی میں نہیں — زین کو کہہ نہیں سکتا کوئی ہم پایۂ بم
لمپ کی شعلہ فشانی میں کہاں وہ انداز؟ — شمع کی بزم طرازی کا جو کچھ ہے عالم
فیصلہ بیٹھ کے چوپال میں کردیگا جو پنچ — ہوگا یورپ کے قوانین سے بڑھکر محکم
اور مانا بھی کہ فردوس بریں ہے یورپ — حضرتِ خواجۂ شیراز یہ کرتے ہیں رقم

"پدرم روضۂ رضوان بدو گندم بفروخت
ناخلف باشم اگر من بہ جوے نفروشم"

ترکوں سے خطاب

جنگ بلقان میں فتح اڈریانوپل پر مبارک باد، ۸- دسمبر ۱۹۱۲ء

اے ترک! اے مجسمۂ کبریائے حق
پشت و پناہِ ملت ختم الامم ہے تو
رنگین ہے تیری تیغ سے ہر صفحۂ وجود
تو نے دکھا دیا کہ تری تیغ جانستاں
رنگیں جو ہے مرقعِ عالم کا ہر ورق

اے وہ کہ جس پہ عالمِ ہستی کو ناز ہے
تو آج زورِ بازوئے شاہ حجاز ہے
مغرب ترا ہی عرصہ گہ ترکتاز ہے
اب بھی فنائے ہستیٔ دشمن کا راز ہے
شمشیر تیری خامۂ رنگیں طراز ہے

ہستیِ مسلم کی رہائی

جنگ بلقان میں وزرائے برطانیہ کے دعوائے اسلام دوستی کی تردید

وہ کہتے ہیں کہ "ہم کو پاس ہے احساسِ مسلم کا"
مگر ہم کیا کریں اس کو کہ عالمگیریِ ملت
منافق ہے جو کہتا ہے کہ "میں ترکی سے یکسو ہوں"

مگر اس کا اثر جو کچھ ہے بس ہندوستاں تک ہے"
عراق و فارس و نجد و حجاز و قیروان تک ہے
یہ وہ الفاظ ہیں جن کی جہانگیری زباں تک ہے

ہمارا جوشِ اسلامی انھیں باور نہیں آتا
پڑا سوتا ہے کوئی گنبدِ خضرا لئے یثرب میں

یہ اندازِ تغافل جلوہ گاہِ امتحاں تک ہے
کہ جس کا بندۂ فرماں زمیں سے آسماں تک ہے

کوئی جا کر یہ کہدے ہم گنہگاروں کی جانب سے
کہ اب مسلم کی ہستی تیرے الطافِ نہاں تک ہے

بمبئی کی وفادار انجمن

جنگ بلقان کے زمانہ میں جب تمام ہندوستان میں وزراے برطانیہ کی طرزِ سیاست کے خلاف جوش و غصہ کی لہر دوڑ رہی تھی بمبئی میں ایک گمنام "فدا اسلامی انجمن بمبئی" کے نام سے اخبارات میں مسلمانوں کے عام خیالات کی مخالفت میں اس کی تجویزیں شائع ہوتی تھیں، مولانا نے اس نظم میں اس کی پردہ دری کی ہے،

ایک دن تھا کہ وفاداریِ مسلم کی متاع
دفعۃً ہو گئی ہنگامۂ بلقان میں گم
ہاتھ آنے کا تو کیا ذکر، پتہ تک بھی نہ تھا
ہو مبارک تجھے اے بمبئی اے نازِ دکن!
تیرے بازار میں وہ یوسفِ گم گشتہ ملا

ہر جگہ عام تھی، اور نرخ میں ارزانی بھی
قوم کو سخت مصیبت تھی پریشانی بھی
ڈھونڈھنے والوں نے گو خاک بہت چھانی بھی
کہ ترے تاج میں ہے طرۂ سلطانی بھی
جس کا مشتاق تھا خود یوسفِ کنعانی بھی

یہ الگ بات ہے، اندھوں کو وہ آئے نہ نظر
گو اسی زمرہ میں ہے "یوسفِ ثوبانی" بھی

مسلم لیگ جب قائم ہوئی تھی، اس کا مقصد گورنمنٹ کے بجائے ہندو ہم وطنوں سے لڑنا اور حکومتِ وقت سے اظہارِ وفاداری کرنا تھا، اسی لئے اس وقت اس کے ممتاز ارکان اور عہدہ داروں میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو خطاب یافتہ امراء اور اربابِ جاہ تھے، لیکن دفعتہً جنگِ طرابلس اور بلقان اور معرکۂ مسجد کانپور کے زمانہ میں حکومتِ برطانیہ کے طرزِ سیاست کو دیکھکر مسلمانوں میں یکے بعد دیگرے مخالفانہ جذبات اور ہیجانات پیدا ہوتے گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرجوش مسلمان جو احرار شمار کئے گئے لیگ سے نفرت کرنے لگے اور کانگریس کی طرف مائل ہونے لگے، یہ دیکھ کر عام رجحانات کے ساتھ لیگ نے بھی اپنی روش میں تغیر مناسب سمجھا اور اپنے مقصد میں ہندوستان کی خود مختار حکومت کا مطالبہ شامل کیا، مگر اسی کے ساتھ لفظ سوٹ ایبل یعنی ہندوستان کے حالات کے مناسب خود مختار حکومت کا لفظ اضافہ کیا، یہ لفظ ایسا ذو معنیین تھا جس سے بلند تر اور پست تر دونوں مقصدوں کو وقت پر مراد لیا جا سکتا تھا، احرار نے اس کی سخت مخالفت کی، لیکن ان کی مخالفت کامیاب نہ ہوئی، بالآخر یہ نتیجہ آپ کے سامنے ہے کہ لیگ مر گئی اور احرار مسلمان تمام تر کانگریس میں داخل ہو گئے، لیگ کے خلاف

اس تحریک کے ابھارنے میں اور احرار کی جماعت کی رہنمائی میں مرحوم مصنف کا بڑا حصہ ہے، اور اس کی یہ نظمیں اس تحریک و انقلاب کا بڑا ذریعہ ہیں،

لیگ کی عظمت و جبروت سے انکار نہیں
ملک میں غلغلہ ہے، شور ہے، کہرام بھی ہے

ہے گورنمنٹ کی بھی اس پہ عنایت کی نگاہ
نظرِ لطفِ رئیسانِ خوش انجام بھی ہے

کوئی ہے جو نہیں اس حلقۂ قومی کا اسیر
اس میں زہاد بھی ہیں، رندِ مے آشام بھی ہے

فیض اس کا ہے باندازۂ طالب، یعنی
بادۂ صاف بھی ہے، دردِ تہِ جام بھی ہے

کعبۂ قوم جو کہتے ہیں بجا کہتے ہیں
مرجعِ خاص ہے یہ، قبلہ گہِ عام بھی ہے

پختہ کاروں کے لئے آلۂ تسخیر ہے یہ
نوجوانوں کو صلائے طمعِ خام بھی ہے

رہنمایانِ نو آموز کا ہے مکتبِ درس
زینۂ فخر و نمایش گریِ عام بھی ہے

جن جہات میں درکار ہے ایثارِ نفوس
اُن میں طرزِ عملِ بوسہ بہ پیغام بھی ہے

صدمۂ مشہد و تبریز سے آنکھیں ہیں پُر آب
دل میں غمخواریِ ترکانِ نکو کام بھی ہے

مختصر اس کے فضائل کوئی پوچھے تو یہ ہیں
محسنِ قوم بھی ہے، خادمِ حکام بھی ہے

ربط ہے اس کو گورنمنٹ سے بھی ملک سے بھی
جس طرح "صرف" میں اک قاعدۂ ادغام بھی ہے

اس کے آفس میں بھی ہر طرح کا سامان ہے درست
ورقِ سادہ بھی ہے، کلکِ خوش اندام بھی ہے

ہیں قرینے سے سجائی ہوئی میزیں ہر سو
جابجا دفترِ پارینۂ احکام بھی ہے

چند بی اے ہیں سند یافتۂ علم و عمل
کچھ اسسٹنٹ ہیں، کچھ حلقۂ خدام بھی ہے

ہو جو تعطیل میں تفریح و سیاحت مقصود
سفرِ درجۂ اوّل کے لئے دام بھی ہے

یہ تو سب کچھ ہے مگر ایک گذارش ہے حضور!
گرچہ یہ سوءِ ادب بھی ہے اور ابرام بھی ہے

مجھ سے آہستہ مرے کان میں ارشاد ہو یہ
"سال بھر حضرتِ والا کو کوئی کام بھی ہے"

مسلم لیگ

جناب لیگ سے میں نے کہا کہ "اے حضرت
کلیم طور پر کرتے تھے عرض قوم کا حال
معاملاتِ حکومت میں دیجئے کچھ دخل
خدانخواستہ ترکِ وفا نہیں مقصود
عدالتوں کی پریشانیاں بیاں کیجے
درازدستیِ پولیس کا کیجئے اظہار
گذر رہی ہے یہ جو کچھ کہ کاشتکاروں پر
شیوعِ علم میں قیدیں جو بڑھتی جاتی ہیں
سنائیے انھیں کچھ بحرِ قہر و جبر کا حال
برادرانِ وطن کہہ رہے ہیں کیا کیا کچھ
کبھی تو رد و قدح کی بھی کیجئے جرأت
نہ ہو سکے تو اشاروں میں کیجئے اظہار
جناب لیگ نے سب کچھ یہ سُنکے فرمایا

کبھی تو جا کے ہمارا بھی ماجرا کہئے
تو آپ شملہ پہ کچھ حال قوم کا کہئے
یہ کیا، کہ قصۂ پارینۂ وفا کہئے
ہر ایک بات باندازِ آشنا کہئے
فسانۂ ستم و جورِ ناروا کہئے
مقدمات کے حالاتِ فتنہ زا کہئے
یہ داستانِ المناک و غم فزا کہئے
یہ کون شیوۂ دانش ہے، اسکو کیا کہئے؟
پھر اس کے بعد ستمہائے ناخدا کہئے
کبھی تو آپ بھی افسانۂ جفا کہئے
جو بات بات پہ ہر بار مرحبا کہئے
وگرنہ لطف تو یہ ہے کہ برملا کہئے
تجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہئے"

لیگ کی دائم المرضی
کی
علّتِ اصل

حضرتِ لیگ نے اب کی سرِ منبر یہ کہا
کہ "بس اب سلف گورنمنٹ" کی تیاری ہے

وہ گئے دن کہ نہ تھی حق طلبی پیشِ نظر
اب تو میری رگِ و پے میں بھی یہی ساری ہے

وہ گئے دن، کہ تملق تھا مرا طرزِ عمل
اب تو جو بات ہے وہ شیوۂ خودداری ہے

اگلی اسکیم سے جو کچھ کہ رہا ہے باقی
وہ فقط شیوۂ تعلیمِ وفاداری ہے

میں نے "یہ سوٹ ابل" کی جو لگا دی ہے قید
یہ عجب نکتۂ آئینِ جہانداری ہے!

فنِ انشا و بلاغت کا بھی رکھا ہے لحاظ
کوئی کیا جانے، کہ کیا اس میں فسوں کاری ہے؟

میں نے اس لفظ میں رکھے ہیں ہزاروں پہلو
ایک جملہ ہے، مگر لاکھ پہ بھی بھاری ہے

آپ جتنا اُسے کھینچیں گے لچک جائے گا
سادگی میں بھی وہی شیوۂ عیاری ہے

یاں تلک کانگریس کا بھی نہ پہونچا تھا خیال
نہ سمجھئے گا، کہ یہ بھی کوئی مختاری ہے

ہوتی جاتی ہیں، جو یہ لیگ کی شاخیں قائم
چشمۂ فیض ہے، جو چار طرف جاری ہے

الغرض جلسۂ سالانہ کے ہوتے ہوتے
آپ دیکھیں گے کہ کیا لیگ کی تیاری ہے

لیگ

شیخ سُوٹ ابل

لیگ کو "سلف گورنمنٹ" ہی اب پیشِ نظر
اللہ الحمد، کہ حل ہوگئی ساری مشکل

اب یہ بیجا ہی شکایت، کہ وہ آزاد نہیں
اب یہ کہنا غلطی ہے، کہ وہ ہی پا در گل

ملک کے جملہ مسائل کی یہی ہے بنیاد
اور جو کچھ ہی، اسی چیز میں ہی سب شامل

لیگ نے حق طلبی میں جو یہ جرأت کی ہے
واقعہ یہ ہی، کہ ہے مدح وثنا کے قابل

کچھ تو ہے لیگ میں جس نے یہ کشش کی پیدا
آپ سے آپ جو کھنچتا ہی ادھر دامنِ دل

لیگ والوں نے جو اسٹیج پہ کیں تقریریں
کر دیئے اس نے خیالات غلط سب باطل

اس دلیری سے ہر اک حرف ادا ہوتا ہے
بعض کہتے تھے کہ "ہے سوء ادب میں داخل"

الغرض لیگ کے اور مجلسِ ملکی کے حدود
یوں ملے آ گئے باہم بحر سے جیسے ساحل

ہاں تو اب عرض یہ ہی خدمتِ عالی میں جناب
"دیکھئے سلف گورنمنٹ کا مقصد حاصل

امتحانات سول کے لئے لندن کی یہ قید
ہے یہ رفتارِ ترقی کے لئے سخت مخل

یہ جو پیمائشِ ارضی کا ہے سی سالہ رواج
ملک کے حق میں ہی یہ زہر سے بڑھ کر قاتل

جو مناصب کہ ولایت کیلئے ہیں مخصوص
آج ابناے وطن بھی تو ہیں اس کے قابل

صیغۂ فوج میں تخفیفِ مصارف ہے ضرور
سینۂ ملک پہ افسوس، کہ بھاری ہے یہ سِل

لیگ نے سن کے یہ سب، مجھ سے باہستہ کہا
آپ سمجھے بھی کہ اس لفظ کا کیا تھا محمل؟

ہم نے گو سلف گورنمنٹ کی خواہش کی تھی
شرط یہ بھی تو لگا دی تھی کہ ہو "سوٹ ایبل"

آپ جو کہتے ہیں، وہ ہے حدِ ادراک سے دور
ہم کو اس خوابِ پریشاں میں نہ کیجے شامل

یہ وہ باتیں ہیں جو مخصوص ہیں یورپ کے لئے
آپ طے پہلے غلامی کی تو کر لیں منزل

سوٹ ایبل سلف گورنمنٹ

دیکھا جو لیگ نے کہ ہوا خاتمہ تمام
از بسکہ دستِ حق طلبی اب دراز ہے

کہنے لگے ہیں سب کہ سیاست کا یہ نظام
مقبولِ خاص و عام نہیں خانہ ساز ہے

تقسیمِ مشرقی نے عیاں کر دیا ہے سب
جو شاہ راہِ حق میں نشیب و فراز ہے

جاری ہے ہر زبان پہ مساوات کا سبق
ہر خاص و عام پر وہ درِ امتیاز ہے

مجبور ہو کے لیگ نے الٹا ہے وہ ورق
جو سر بسر مرقعِ نیرنگ ساز ہے

چہرہ پہ ہے جو سلف گورنمنٹ کا نقاب
ہر دیدہ ور اسیرِ طلسمِ مجاز ہے

سمجھے نہ یہ کہ "سوٹ ایبل" کی جو شرط ہے
تمہیدِ سجدہ ہائے جبینِ نیاز ہے

سمجھے نہ لوگ یہ، کہ یہی لفظ پُر فریب
اس ملک میں طلسمِ غلامی کا راز ہے

سب یہ سمجھ رہے ہیں کہ اب لیگ و کانگریس
دونوں کا ایک عرصہ کہ ترک تاز ہے

جب تک کہ لوگ حلقہ بگوشِ نیاز ہیں
جب تک زبانِ قوم خوشامد طراز ہے
جب تک ہیں لوگ عالم بالا سے مستفیض
جب تک بہم یہ دورِ قدح ہائے راز ہے
"احرار" سے کہو کہ نہیں کچھ امیدِ "صلح"
ٹلتا نہیں جو تفرقہ و امتیاز ہے

آزادیِ خیال پہ تم کو ہے گر غرور
تو لیگ کو بھی شانِ غلامی پہ ناز ہے

مسلم لیگ

لوگ کہتے ہیں کہ آمادۂ اصلاح ہے لیگ
یہ اگر سچ ہے تو ہم کو بھی کوئی جنگ نہیں
صیغۂ راز سے کچھ کچھ یہ بھنک آتی ہے
کہ ہم آہنگیِ احباب سے اب ننگ نہیں
فرق اتنا تو بظاہر نظر آتا ہے ضرور
اب خوشامد کا ہر اک بات میں وہ رنگ نہیں
عرضِ مطلب میں زباں کچھ تو ہی کھلتی جاتی
گرچہ اب تک بھی حریفوں سے ہم آہنگ نہیں
وہ بھی اب نقدِ حکومت کو پرکھتے ہیں ضرور
جن کو اب تک بھی تمیزِ گہر و سنگ نہیں
قوم میں پھوٹ نکلتے رہتے ہیں جو افسونِ وفا
ان کی افسانہ طرازی کا بھی وہ ڈھنگ نہیں
وہ بھی کہتے ہیں کہ اس جنسِ وفا کی قیمت
جس قدر ملتی ہے ذرہ کے بھی ہم سنگ نہیں
آگے تھے حلقۂ تقلید میں جو لوگ اسیر
سمتِ رفتار تو اب بھی ہیں مگر لنگ نہیں

آپ لبرل جو نہیں ہیں تو بلا سے نہ سہی
یاں کسی کو طلبِ افسری و رنگ نہیں

کام کرنے کے بہت سے ہیں جو کرنا چاہیں
سال میں یہ جو تماشا سا ہوا کرتا ہے
کچھ تو نظم و نسقِ ملک میں بھی دیجے دخل
کچھ نہ کچھ نظمِ حکومت میں ہے اصلاح ضرور

اب بھی یہ دائرۂ سعی و عمل تنگ نہیں
کام کرنے کا یہ انداز نہیں ڈھنگ نہیں
شیوۂ حق طلبی ہے، یہ کوئی جنگ نہیں
ہم نہ مانیں گے کہ اس آئینہ میں زنگ نہیں

کم سے کم حاکمِ اضلاع تو ہوں اہلِ وطن
کیا ہزاروں میں کوئی صاحبِ فرہنگ نہیں

خطاب بہ رائٹ آنریبل سید امیر علی

سنہ ۱۹۱۲ء میں مسلم لیگ نے اپنے اہم اجلاس کے لئے جس میں احرار کی در اندازی کا خوف تھا، آنریبل سید امیر علی کو صدارت کے لئے نامزد کیا تھا، انھوں نے منظور کیا، مگر عین وقت پر اس لئے انکار کیا کہ لیگ سفر خرچ کی رقم مہیا نہ کر سکی

اغماض چلتے وقت، مروّت سے دور تھا
ہر چند لیگ کا نفسِ واپسیں ہے اب
وہ دن گئے کہ بتکدہ کو کہتے تھے حرم
وہ دن گئے کہ شانِ غلامی کے ساتھ بھی
وہ دن گئے کہ شارعِ اوّل" کا حرف حرف
وہ دن گئے کہ فتنۂ آخر زماں کے بعد

اس وقت پاس آپ کا ہونا ضرور تھا
اس ہستیِ دو روزہ پہ جس کو غرور تھا
وہ دن گئے کہ خاک کو دعویٰ نور تھا
ہر بوالہوس خمارِ سیاست میں چور تھا
ہم پایۂ کلامِ سخن گوے طور تھا
گویا کہ اب امامِ زمان کا ظہور تھا

اب معترف ہیں دیدہ ورانِ قدیم بھی
اس نقشِ سیمیا میں نظر کا قصور تھا

اس دستِ مرتعش میں نہ تھی قوتِ عمل
اک کاسنہ تہی یہ سر پر غرور تھا

یہ لمعۂ سراب، نہ تھا چشمۂ بقا
یہ تیرگی تھی، جس کو سمجھتے تھے نور تھا

آئینِ بندگی میں تملق کی شان تھی
اخلاص وصدق، شائبۂ مکر وزور تھا

ان کی دکان کی وہ ہوا اب بگڑ چلی
جن کے گھروں میں جنسِ وفا کا وفور تھا

اب یہ کھلا کہ واقفِ سر تھا اسی قدر
جو جس قدر مقامِ تقرب سے دور تھا

ہر دم برادرانِ وطن کی برائیاں!
ظاہر ہوا کہ فتنۂ اربابِ زور تھا

سب مٹ گیا سیاستِ سی سالہ کا طلسم
اک ٹھیس سی لگی تھی کہ یہ شیشہ چور تھا

لے دے کے رہ گیا تھا سہارا بس آپ کا
یہ جسم مردہ منتظرِ نفخِ صور تھا

امید تھی کہ ابکی بدل جائیں گے اصول
مٹ جائیگا نظام میں جو کچھ فتور تھا

ہو گی کچھ اب نظامِ حکومت پہ گفتگو
جس دن کا منتظر کہ ہر اک باشعور تھا

دینگے برادرانِ وطن کو پیامِ صلح
آویزشِ عبث سے ہر اک دل نفور تھا؟

یہ کیا ہوا کہ آپنے بھی بے رخی سی کی؟
کیا آپ کو بھی رازِ نہاں پر عبور تھا؟

یا یہ سبب ہوا کہ پراگندہ تھا مزاج
از بسکہ "آستانہ" میں شورِ نشور تھا؟

ممکن ہے اور بھی ہوں کچھ اسبابِ ناگزیر
یہ سب سہی، پہ آپ کا آنا ضرور تھا

مسلم لیگ

لیگ کو جب نظر آیا کہ چلی ہاتھ سے قوم
منظرِ عام پہ لوگوں سے کیا اس نے خطاب
اک ذرا سی مگر اس لفظ میں تخصیص بھی ہے
یعنی وہ سلف گورنمنٹ کہ ہو "سوٹ ایبل"
یہ مسلّم کہ ہر اک ملک کی حالت ہے جدا
جو حکومت کہ کناڈا کے لئے ہو موزوں
ملک میں ہم بھی ہیں، ہندو بھی ہیں، عیسائی بھی

اک نیا روپ بھر اس نے بہ اندازِ دگر
کہ نہیں سلف گورنمنٹ سے اب ہمکو مفر
جس سے ہیں متفق اللفظ سب اربابِ نظر
یا کہ موزون و مناسب ہو بالفاظِ دگر
جس کا آئینِ حکومت پہ بھی پڑتا ہے اثر
ہے وہی مملکتِ ہند میں سرمایۂ شر
جو کہ ہیں نخلِ حکومت کے لئے برگ و ثمر

واقعی قید "مناسب" ہی بجا اور موزوں
پہلے بھی آپ تو اس حصن میں لیتے تھے پناہ
جب کبھی کوئی بھی تحریک سیاسی ہوگی
اب بھی ہیں جادۂ مقصد کے وہی نقشِ قدم
یہ وہی لفظ ہے مجموعۂ صد گونہ فریب
آپ ہر بار جو بڑھ بڑھ کے پلٹ آتے ہیں

آپ اس قید کو کس کام میں لائیں گے مگر؟
پہلے بھی آپ اسی دشت میں تھے راہ سپر
آپ اس قید "مناسب" کو بنائیں گے سپر
اب بھی اوراقِ سیاست کا وہی ہے مسطر
یہ وہی لفظ ہے سرمایۂ صد گونہ ضرر
ہے اسی شیوۂ تعلیمِ غلامی کا اثر

آپ کے فلسفۂ نو کے یہ الفاظِ جدید / گو بظاہر ہیں فریبندۂ اربابِ بصر

ہے حقیقت میں اسی متنِ غلامی کی یہ شرح / ہے حقیقت میں اسی نخلِ سیاست کا ثمر

چند جملے جو زبانوں پہ چلے آتے ہیں / آپ دہراتے ہیں ہر بار باندازِ دگر

ایک ان میں سے ہے یہ بھی کہ "ابھی وقت نہیں" / ہے اسی لفظ کی تشریح یہ الفاظِ دگر

آج یہ لفظ "مناسب" جو نیا وضع ہوا / آپ اسی نقطہ کو ہر بار بنائیں گے سپر

آپ کے دائرۂ بحث کا مرکز تھا یہی / آپ کی گردشِ پیہم کا یہی تھا محور

آپ اس دام سے برسوں بھی نہ چھوٹیں گے کبھی / آپ اس کوچۂ پُر خم سے نہ ہونگے سر بر

آپ اس بھول بھلیاں سے نہ نکلیں گے کبھی / دل سے جائیگا نہ تعلیم غلامی کا اثر

جب کہیں بھی کوئی پہلو سے غلامی ہوگا / ہر طرف پھر کے اسی نقطہ پہ ٹھہرے گی نظر

اس قدر سرد مزاج اور پھر اس پر تبرید / خوف یہ ہے کہ پہنچ جائے نہ فالج کا اثر

آپ کچھ گرم دوائیں جو گوارا فرمائیں
ہم دعا گو یہ سمجھتے ہیں کہ ہوگا بہتر

خطاب بہ احرار
ایک مرکز کی ضرورت

یہ جو لیڈر شکنی آپ نے کی خوب کیا / قوم اب طوقِ غلامی سے ہے بالکل آزاد

لوگ اب حلقۂ تقلید میں ہوں گے نہ اسیر
ٹوٹ جائے گا طلسمِ اثرِ استبداد

ہاں مگر ایک گذارش بھی ہے یہ قابلِ غور
یہ تو فرمائیے اس باب میں کیا ہے ارشاد؟

بتکدے آپ نے ڈھائے بہت اچھا لیکن
شرط یہ ہے کہ حرم کی بھی تو رکھیے بنیاد

آبلہ قابلِ نشتر تھا، یہ مانا، لیکن
دیکھیے یہ کہ کہیں زخم میں آئے نہ فساد

آپ کہتے ہیں کہ وہ مجمعِ ناجائز تھا
خیر جو کچھ تھا، مگر جمع تو تھے کچھ آزاد

اب کوئی مرکزِ قومی ہے نہ توحیدِ خیال
نہ کوئی جادۂ مقصد ہے نہ کچھ توشۂ زاد

خوف یہ ہے کہ بکھر جائے نہ شیرازۂ قوم
خوف یہ ہے کہ یہ ویرانہ نہ ہو پھر آباد

ذرّے جس طرح سے ہو جاتے ہیں اڑ اڑ کے فنا
یونہی مٹ جائے گی پھر قوم بھی آخر برباد

نکتہ چینی سے فقط کام نہیں چل سکتا
یہ بھی لازم ہے کہ کچھ کام بھی ہو پیشِ نہاد

بھاپ پر زور ہے لیکن کوئی انجن بھی تو ہو
کام کیا آئے گا نشتر جو نہ ہوگا فصّاد

جزر و مد

الہلال کا لب و لہجہ

دیکھ کر حریتِ فکر کا یہ دورِ جدید
سوچتا ہوں کہ یہ آئینِ خرد ہے کہ نہیں؟

رہنماؤں کی یہ تحقیر، یہ اندازِ کلام
اس میں کچھ شائبۂ رشک و حسد ہے کہ نہیں؟

اعتراضات کا انبار جو آتا ہے نظر
اس میں کچھ قابلِ تسلیم و سند ہے کہ نہیں؟

نکتہ چینی کا یہ انداز، یہ آئینِ سخن،
بزمِ تہذیب میں مستوجبِ رد ہی کہ نہیں؟

جس نئی راہ میں ہیں بادیہ پیما یہ لوگ
کوئی اس جادۂ مشکل کا بلد ہے کہ نہیں؟

شاطروں نے جو نئی آج بچھائی ہے بساط
اس میں ان پر بھی کہیں سے کوئی زد ہی کہ نہیں؟

پہلے گر شانِ غلامی تھی، تو اب خیرہ سری
اس دورا ہے میں کوئی بیچ کی حد ہی کہ نہیں؟

فیصلہ کرنے سے پہلے، میں ذرا دیکھ تو لوں
"جزر" جیسا تھا اسی زور کا "مد" ہی کہ نہیں؟

احرارِ قوم

اور

طفلِ سیاست

یہ اعتراض آپ کا بیشک صحیح ہے
احرارِ قوم میں ہیں بہت خامیاں ابھی

چلتے ہیں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
گم گشتہ طریق ہے، یہ کارواں ابھی

زود اعتقادیاں ہیں، تلون ہی، وہم ہے
ہو جاتے ہیں ہر ایک سے یہ بدگماں ابھی

دل میں نہ عزم ہے، نہ ارادوں میں ہی ثبات
چھیلے نہیں ہیں معرکۂ امتحاں ابھی

بے اعتدالیاں ہیں اداے کلام میں
باہر ہے اختیار سے ان کی زباں ابھی

ہر دم ہیں گو مسائلِ ملکی زبان پر
اُن میں ہر ایک بھی تو نہیں نکتہ داں ابھی

یہ سب بجا درست، مگر سچ جو پوچھئے — جو کچھ کہ ہے، یہ ہے اثرِ رفتگاں ابھی

یہ ہے اسی سیاستِ پارینہ کا اثر — گو شمع بجھ چکی ہے، مگر ہے دھواں ابھی

موزوں نہیں ہے جنبشِ اعضا تو کیا عجب — شب کے خمار کی ہیں یہ انگڑائیاں ابھی

چلنے میں لڑکھڑاتے ہیں اک اک قدم پہ پاؤں — چھوٹے ہیں قید سخت سے یہ خستہ جاں ابھی

بیکار کر دیئے تھے جو خود بازوئے عمل — گو کھینچتے ہیں پر نہیں کھنچتی کماں ابھی

آئے کہاں سے قوتِ رفتار پاؤں میں — کچھ بیڑیاں ہیں پاؤں کی بندِ گراں ابھی

غوں غاں ہے، کچھ مباحثِ ملکی نہیں ہیں یہ
اک طفل ہے، سیاستِ ہندوستاں ابھی

کفرانِ نعمت

منکرِ مے بودن و ہمرنگِ مستاں زیستن

معترض ہیں مجھ پہ یہ میرے مہربانانِ قدیم — جرم یہ ہے میں نے کیوں چھوڑا وہ آئینِ کہن؟

میں نے کیوں لکھے مضامینِ سیاست پے بہ پے — کیوں نہ کی تقلیدِ طرزِ رہنمایانِ زمن؟

"کانگریس سے" مجھ کو انکارِ برأت کیوں نہیں — کیوں حقوقِ ملک میں ہوں ہندوؤں کا ہم سخن؟

خیر! میں تو شامتِ اعمال ہوں جو ہوں سو ہوں — آپ تو فرمائیے، کیوں آپ نے بدلا چلن؟

آپ نے شملہ میں جا کر کی تھی جو کچھ گفتگو — ماحصل اس کا فقط یہ تھا پس از تمہیدِ فن

سعی بازو سے ملیں جب ہندوؤں کو کچھ حقوق — اس میں کچھ حصہ ملے ہم کو بھی بہرِ "پنجتن"

یعنی جا کر شیر جب جنگل سے کر لائے شکار
لومڑی پہنچے کہ کچھ مجھ کو بھی اے سرکار بن

لیکن اب تو آپ کی بھی کھلتی جاتی ہے زباں
آپ بھی اب تو اڑاتے ہیں وہی طرزِ سخن

اب تو "مسلم لیگ" کو بھی خواب آتے ہیں نظر
اب تو ہے کچھ اور طرزِ نغمۂ مرغِ چمن

ملک پر اپنی حکومت چاہتے ہیں آپ بھی
تھا یہی تو منتہائے فکر، یارانِ وطن

آپ نے بھی اب تو نصب العین رکھا ہے وہی
"کانگرس" کا ابتدا سے ہے جو موضوعِ سخن

آپ بھی تو جادۂ "سید" سے اب ہیں منحرف
اب تو اوراقِ وفا پر آپ کے بھی ہے شکن

جب یہ حالت ہے، تو پھر ہم پر ہے کیوں چشمِ عتاب
"منکرِ مے بودن و ہم رنگِ مستاں زیستن"

ہنگامۂ مسجد کان پور

سنہ ۱۹۱۲ء

مسلمانانِ ہندوستان کے مذہبی و قومی جوش و خروش کے طوفان کا یہ سب سے بڑا خونین منظر ہے، جو عین اس وقت رونما ہوا جب جنگِ بلقان کی آگ ایک طرف ہندوستان سے ہزاروں میل دور روشن تھی، اور مسلمانوں کے دل برطانی وزارتِ خارجہ کی روشِ سیاسی سے سخت مشتعل تھے، اور دلوں کا بخار نکلنے نہیں پایا تھا، کہ صوبہ متحدہ کے گورنر سر جیمس مسٹن اور ان کے ماتحت حکامِ کان پور کی غلط کاریوں نے خود ہندوستان میں اس کا ایک موقع بہم پہنچا دیا، کان پور کے محلہ مچھلی بازار میں ایک مسجد برسرِ راہ تھی، وہاں سے ایک نئی سڑک نکالی گئی جس میں مسجد کا ایک حصّہ جو وضو خانہ تھا بیچ میں آگیا، اور مسلمانوں کی مرضی کے خلاف زبردستی اس کو منہدم کر دیا گیا، اس واقعہ نے تمام مسلمانوں میں ایک آگ سی لگا دی، ۳ رمئی کو مسلمان کان پور نے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا، جلسہ میں کافی جوش و خروش پیدا ہوا، جلسہ کے بعد پر جوش مسلمانوں نے جن میں بچے بھی تھے مسجد کا رخ

کیا اور مسجد کی منہدم دیوار پر اینٹیں چن چنکر رکھنے لگے، حکام نے یہ دیکھ کر نہایت بے رحمی سے اس غیر مسلح فوج پر حملہ کرنے کا حکم دیا، اور باقاعدہ فوجی پولیس کے سپاہیوں اور سواروں نے ان پر گولیاں برسائیں، زخمیوں میں ننھے ننھے بچے شامل تھے، شہداء کی تعداد کا صحیح اندازہ معلوم نہ ہوا، اس خونین سانحہ نے تمام ہندوستان کو خونی بنا دیا، مقرروں کی زبانوں، محررین کے قلم اور شعراء کے رجز اور نالوں نے تمام ہندوستان کو دفعۃً بیدار کر دیا، یہ واقعہ مسلمانانِ ہند کی سیاسی جدوجہد اور آزادی پرستی کے سلسلۂ تاریخ کی ایک اہم کڑی ہے، مولانا مرحوم پر اس واقعہ نے بے حد اثر کیا، اور یہ اثرات نالہاے موزوں بنکر ان کی زبان و قلم سے ادا ہوے، اور انھوں نے ملک کے انقلاب میں مستقل طور سے بہت بڑا حصہ لیا، اس واقعہ کے کئی برس کے بعد تک یہ نظمیں ہندوستان میں بچہ بچہ کی زبان پر تھیں، اور اب بھی ہیں،

بعض مسلمان اکابر کی ثالثی سے خود وایسرائے نے کانپور جا کر حکامِ کانپور اور عام مسلمانوں کے درمیان ایک صلحنامہ مرتب کیا، جس کے رُو سے نیچے سڑک اور اوپر مسجد کی چھت قائم رکھی گئی،

ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں

کل مجھ کو چند لاشۂ بیجاں نظر پڑے	دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں

کچھ طفلِ خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
آئے تھے اس لئے کہ بنائیں خدا کا گھر
کچھ نوجوان ہیں، بے خبرِ نشۂ شباب
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بیدریغ
سینہ پہ ہم نے روک لیے برچھیوں کے وار
ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھدیتے ہیں جو سر
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا

بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
نیند آگئی ہے، منتظرِ نفخ صور ہیں
ظاہر ہیں گرچہ صاحبِ عقل و شعور ہیں
مجرم کوئی نہیں ہے، مگر ہم ضرور ہیں
ازبسکہ مست بادۂ ناز و غرور ہیں
لذّت شناسِ ذوقِ دلِ ناصبور ہیں
جو خاک و خون میں بھی ہمہ تن غرقِ نور ہیں

پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
"ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں"

علمائے زندانی

مساجد کی حفاظت کیلئے پولس کی حاجت ہے
عجب کیا ہی کہ اب ہر شاہراہ سے یہ صدا آئے
پنہائی جا رہی ہیں عالمانِ دیں کو زنجیریں
یہی دن ہیں اگر ہیں کشتگانِ خنجر اندازی
شہیدانِ وفا کے قطرۂ خوں کام آئیں گے
عجب کیا ہی جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں

خدا کو آپ نے مشکور فرمایا عنایت ہی
"مجھے بھی کم سے کم اک غسل خانہ کی ضرورت ہی"
یہ زیورِ سیّدِ "سجادِ" عالی کی وراثت ہی
تو مجھ کو سستیِ بازوے قاتل کی شکایت ہی
عروسِ مسجدِ زیبا کو افشاں کی ضرورت ہی
کہ یہ بچے ہیں ان کو جلد سو جانے کی عادت ہی
کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محرومِ سعادت ہے

آپ ظالم نہیں زنہار یہ ہم ہیں مظلوم

ہم غریبوں کو نہ پہلے تھا، نہ اب ہے انکار
کہ ہر اک شہر میں ہے آپ کے انصاف کی دھوم

یہ بھی تسلیم ہے ہم کو کہ یہ جو کچھ کہ ہوا
اس میں ملحوظ رہے عدل کے آداب و رسوم

آپ قانون کی حد سے نہ بڑھے یک سرِ مو
فیر کا حکم دیا آپ نے جب بہرِ ہجوم

یہ حقیقت بھی مگر قابلِ انکار نہیں
کہ بیک چشم زدن موت کو تھا اذنِ عموم

گولیاں کھا کے جو گرتے تھے جوانانِ حسین
سب یہ کہتے تھے "قیامت ہے کہ جھڑتے ہیں نجوم"

گولیوں کے تھے نشاں منبر و محراب پہ بھی
بسکہ درکار ہیں مسجد کے لئے نقش و رسوم

جابجا خون سے مسجد ہے نگاریں اب تک
یہ وہ صنعت ہے کہ تا حشر نہ ہوگی معدوم

پا بہ زنجیر تھے مجرم بھی تماشائی بھی
اور پولیس کو یہ تھا عذر کہ "ہم ہیں محکوم"

واقعہ یہ ہے غرض، کوئی نہ مانے نہ سہی
"آپ ظالم نہیں زنہار، یہ ہم ہیں مظلوم"

کانپور میونسپلٹی کا خطاب

مسجد مچھلی بازار کانپور سے

اے مسجدِ شکستہ! اکنوں دلگراں مدار
کآمادہ گشت چارۂ دردِ نہانِ تو

تا دورِ چرخ و قاعدۂ آسماں بجاست
پائندہ باد، نامِ تو و ہم نشانِ تو

ہرگز "بجانِ تو" کہ گوارا نہ کردہ ام
اکنوں برادرانہ بیا، قسمتے کنیم
ہیچم دریغ نیست کہ برجاے اوّلیں
امّا بشرطِ آنکہ گذارند بہرِ من

اندیشہ کہ سودِ من است و زیانِ تو
تا بانگِ مرحبا شنوم از زبانِ تو
پر پاکنند بام و در و سایہ بانِ تو
از خاک تا بلندیِ سقفِ مکانِ تو

"از صحنِ خانہ تا لبِ بام، از آنِ تو
وز بامِ خانہ تا بہ ثریا، از آنِ تو"

شرائطِ صلح

لوگ کہتے ہیں کہ حکام ہیں آمادۂ صلح
لیکن انعام گرانقدر و وظائف کی طرح
مایۂ بحث اگر ہے، تو فقط مسجد ہے
دادخواہِ حقِ مسجد ہیں اسیرانِ جفا
ہم سے خود ذوقِ اسیری نے کیا نوں میں کہا
جزوِ مسجد کو اگر آپ سمجھتے ہیں حقیر
آپ کہتے ہیں "وضو خانہ تھا مسجد تو نہ تھی"
آپ اس بحث کی تکلیف نہ فرمائیں کہ آپ
بند کرتے ہیں جو یہ آپ جرائد کی زباں

یہ اگر سچ ہے تو جز خوبیِ تقدیر نہیں
یہ حقیقت میں کوئی صلح کی تدبیر نہیں
دیتِ قتلِ شہیدانِ جواں میر نہیں
ورنہ ان کو گلۂ سختیِ تقدیر نہیں
کہ "خمِ طرۂ محبوب ہے زنجیر نہیں"
آپ کے ذہن میں اسلام کی تصویر نہیں
یہ بجا مسئلۂ فقہ کی تعبیر نہیں
حاملِ فقہ نہیں، واقفِ تفسیر نہیں
یہ بھی کچھ مانعِ آزادیِ تحریر نہیں

اور بھی برہمی طبع کا سامان ہے یہ
فتح اس طرح کیا کرتے ہیں اقلیمِ قلوب
اور ہی کچھ ہے گرفتاریِ دل کی تدبیر
جبر سے برہمیِ عام کا رکنا ہے محال
داد خواہوں سے ہز آنر نے جو ارشاد کیا
حسنِ ظن کے جو گرفتار تھے یہ بول اٹھے

فتنۂ عام کے دبنے کی یہ تدبیر نہیں
تیر ترکش میں نہیں ہاتھ میں شمشیر نہیں
سختیِ طوق و گراں باریِ زنجیر نہیں
یعنی اس خوابِ پریشاں کی یہ تعبیر نہیں
کہ "یہ حکمِ ازلی قابلِ تغییر نہیں"
اس مرقع میں بھی انصاف کی تصویر نہیں

ہم اسیرانِ محبت سے یہی ہے جو سلوک
پھر نہ کھیے گا کہ فتراک میں نخچیر نہیں

خون کے چند قطرے

اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی
بچا رکھے ہیں، مگر میں نے چند قطرۂ خون

اگرچہ صدمۂ بلقان سے جگر شق ہے
کہ کانپور کے بھی زخمیوں کا کچھ حق ہے

دنیا میں مسلمانوں کی تعداد کیوں نہیں بڑھتی

کیا پوچھتے ہو یہ کہ رسولِ عرب کی قوم
سُن لو وہ گنجہائے گراں مایہ دفن ہیں

کیوں گھٹ رہی ہے آج عدد میں ظہور میں
کچھ بلقان کی خاک میں کچھ کانپور میں

———— • ————

تقسیم عمل

ہر یکے از ما چو کارِ خویشتن انجام داد آں بود ٹیلر[1] کہ فرماں داد بہرِ قتلِ ما	تا چرا ایں یک شکایت می کند از دیگرے "ایں منم کاندر میانِ خاک و خوں بینی سرے"

پابہ زنجیرانِ کانپور

ہم قدم آپ کا ہونا تو بہت ہے دشوار پاؤں کٹنے کا مجھے[2] آج ہوا ہے صدمہ	ان کا کیا ذکر جو اس درد میں شامل ہی نہیں یعنی افسوس میں زنجیر کے قابل ہی نہیں

وضو خانہ

گفتی[3] کہ وضو خانہ بہ تعظیم نہ یرزد ما بندۂ فرمانِ تو ہستیم، ولیکن	زاں رو کہ آں خانہ نہ مسجد نہ کنشت است "معشوقِ من آنست کہ نزدیکِ تو زشت است"

[1] کلکٹر کانپور [2] مولانا کا ایک پاؤں بندوق کے صدمہ سے کٹ گیا تھا،

[3] یہ حکام کا استدلال تھا کہ یہ منہدم حصہ مسجد میں داخل ہی نہ تھا، یہ تو وضوخانہ تھا، اس لئے اس کے منہدم کرنے میں کوئی ہرج نہیں،

تفرق و تجزی

ہیں جس چیز نے کھویا وہ تفرق و تجزّی تھی
مگر اب تو در و دیوار تک اس کا اثر پہونچا

یہ وہ شے ہے کہ جو بربادیِ مسلم کے درپے ہے
وضوخانہ الگ اک چیز ہے مسجد الگ شے ہے

وحدت و کثرت

وحدت جسے کہتے ہیں وہ کثرت سے الگ ہے
اس وہم کے دھوکے میں مگر آپ نہ آئیں

یہ تفرقہ بے شبہہ ہے مجھ کو نظر آتا
احول ہوں مجھے ایک بھی ہے دو نظر آتا

مسجد کانپور کا وفد

اور سر جیمس مسٹن[1] کا جواب

"کردم و شد"

حضرتِ لاٹ بفرمود کہ فرمان فرمائے
صدرِ اعظم بسوے قسمتِ بنگالۂ شرق[2]

نیست ممکن کہ دگر بگذرد از گفتۂ[3] خود"
شگے کرد و بہ فرمود کہ "من کردم و شد"

[1] سر جیمس مسٹن گورنر صوبہ متحدہ نے مسجد کا جو فیصلہ کیا تھا مسلمان اس میں بھی ترمیم کرانا چاہتے تھے، گورنر صاحب نے جواب دیا کہ جو فیصلہ ہوچکا اس میں ترمیم ممکن نہیں [2] اس لفظ میں ایک لطیف تلمیح ہے، لارڈ کرزن نے جب بنگال کی تقسیم کی تھی، مشرقی اور مغربی بنگال، تو بنگالیوں نے سخت ہنگامہ برپا کیا، اس کے جواب میں وزیر اعظم نے فرمایا تھا کہ "ہماری حکومت کے احکام میں تغیر و تبدل نہیں، یہ مختتم معاملہ ہے" اور اس میں تنسیخ قطعاً غیر ممکن، مگر اس تیقن اور تاکید کا منظریہ نظر آیا کہ شہنشاہ برطانیہ نے دلّی آکر تاجپوشی کے موقع پر اس ناقابلِ تنسیخ حکم کو منسوخ کردیا، اسی طرح مسجد کا معاملہ بھی ہوگا،

شمشیر برطانیہ
اور
گربۂ حریت

جنابِ لاٹ از فرمودۂ خود برنمی گردد	کہ تمکینِ حکومت راسیاست بیشتر باید
و لے در قسمتِ بنگالہ ایں اندیشہ می بایست	کہ "گربہ کُشتن اوّل روز می باید اگر باید"

خطاب بحضور ویسرائے

لارڈ ریڈنگ ویسرائے خود کانپور آکر مسجد کانپور کا فیصلہ کرتے ہیں' اور
تمام قیدی آزاد ہوتے ہیں، شاعر کا اس پر اظہار شکریہ،

اے ہمایوں گہر و افسر و اورنگِ شہی	وہ کیا تو نے جو آئینِ جہاں بانی ہے
تو نے ظاہر میں رعایا سے جو کھائی ہے شکست	یہ حقیقت میں ظفر مندیِ سلطانی ہے
تو نے سمجھا کہ رعایا کا وہ انبوہ، وہ جوش	گرچہ زاید نہ سہی، فطرتِ انسانی ہے
تیرے لطف و کرمِ عام نے دیدی یہ ندا	کوئی مجرم ہے، نہ قیدی ہے، نہ زندانی ہے
تو نے اک آن میں گرتا ہوا گھر تھام لیا	بازوؤں میں یہ ترے زورِ جہانبانی ہے
بات رکھ لی تری تقریر نے حکام کی بھی	گرچہ لازم انھیں اظہارِ پشیمانی ہے
گرچہ مدحِ امرا میں نے نہیں کی ہے کبھی	شکرِ احسان مگر فطرتِ انسانی ہے

تیرے دربار میں پہنچیں گے جو اوراقِ سپاس
ان میں یہ پیشکشِ شبلی نعمانی ہے

مسلم یونیورسٹی

مسلمانوں کے خواب کی تعبیر

مسلمانوں کے اس عین بحرانِ جوش کے زمانہ میں، شاید مسلمانوں کی عنانِ توجہ کو سیاسیات سے تعلیمات کی طرف متوجہ کرنے کے لئے مسلم یونیورسٹی جو سرسید کے عہد سے مسلمانوں کی سب سے خوشگوار تمنا اور ان کی سی سالہ قومی جدوجہد کا محور تھی، اس کی تحریک سر آغا خاں کی علمبرداری میں شروع کی گئی، اور اس کے لئے قوم سے تیس لاکھ کا چندہ مانگا گیا جو بہت جلد جمع ہوگیا، مولانا مرحوم یونیورسٹی وفد کے ساتھ پنجاب گئے اور لاہور کے ایک جلسہ میں انھوں نے یہ نظم پڑھی،

ہمیں یک حرف از یونیورسٹی مدعا باشد — کہ ایں سررشتۂ تعلیم ما در دستِ ما باشد
علومِ تازہ را با شرع و حکمت باہم آمیزیم — الٰہی با ریاضی و طبیعی آشنا باشد
بساطے تازہ چینیم و طرحے نو دراندازیم — کہ در بزمِ نوی پیشینیاں را نیز جا باشد
کنوں دہ سال شد کیں خواب نوشیں در نظر داریم — کہ خوابِ ایں چنیں خود جاں نواز و جانفزا باشد

وے پیدا نہ شد ایں خواب را چوں صبح تعبیرے
گہے باخویش می گفتیم کاساں گردد ایں مشکل
بود آساں کہ چوں طفلاں دو سہ نقشی کشی وانگہ
وے آساں نباشد درسگاہے را بنا کردن
دریں بودیم ما کز پردہ گاہِ غیب سر بر زد
سر آغا خاں کہ خود خواب است ایں تعبیر نوشیں را
بکیش شیعہ و سنی سر آغا خاں خدا نبود

گماں بردیم کیں اندیشہ از روئے خطا باشد
وے بایستہ صد محنت و رنج و عنا باشد
بگوئی کیں در و بام است و ایں قصر و سرا باشد
کہ خود ہر گونہ گوں رنجوری ما را شفا باشد
ہمایوں طلعتے کیں عقدہ را مشکل کشا باشد
چہ خوش باشد کہ خواب از ما و تعبیر از خدا باشد
ولیکن کشتیِ اسلامیاں را ناخدا باشد

کنوں بینی کہ زود آں گلشنِ رنگیں بپا گردد
کہ شبلی ہم دروے یک بلبلِ رنگیں نوا باشد

"یونیورسٹی کے سلسلہ میں سب سے اہم مسئلہ مسلمانوں کے اور گورنمنٹ کے درمیان بعض شرائط کے تصفیہ کا تھا، ان میں تین باتیں سخت متنازع فیہ تھیں،

۱۔ مسلمان چاہتے تھے کہ یونیورسٹی کا نام "مسلم یونیورسٹی" ہو، اور گورنمنٹ "علی گڈھ یونیورسٹی" کہتی تھی،

۲۔ مسلمان چاہتے تھے کہ یونیورسٹی کو ہندوستان میں مسلمانوں کے جس قدر کالج اور اسکول ہیں، ان کے الحاق کا اختیار رہو، گورنمنٹ اس کو تسلیم نہیں کرتی تھی، اور اب تک تسلیم نہیں کیا،

۳۔ گورنمنٹ نے یونیورسٹی کے متعلقہ امور کا آخری فیصلہ (ویٹو) اپنے

حکامِ اعلیٰ کو دینے پر مصر تھی اور رہے، مسلمان اس کے ماننے کے لئے تیار نہ تھے
اربابِ علی گڈھ چراغ پا تھے کہ اہم مسائل میں عام مسلمانوں کو دخل اندازی کی حاجت نہیں، بہرحال اس بحث کو طے کرنے کے لئے لکھنؤ کے قیصر باغ میں یونیورسٹی کا اساسی جلسہ (فونڈیشن کمیٹی) ۲۸- دسمبر ۱۹۱۲ء کو ہوا تھا، جس میں ملک کے تمام اکابر اور رہنمایانِ ملت شریک تھے، اس میں اربابِ علی گڈھ راجہ صاحب محمود آباد کی سرکردگی میں ایک طرف تھے، اور احرار کی جماعت مسٹر محمد علی (اب مولانا) اور مولنا ابوالکلام کی سیادت میں دوسری طرف تھی، پہلے روز کے اجلاس میں محمد علی صاحب نے جلسہ میں نہایت جوش پیدا کیا، اور احرار کی سربراہی کی، لیکن دوسرے دن دفعتہً معاملہ بدل گیا، واقعات شبینہ کیا تھے، کم لوگوں کو معلوم ہیں، بہرحال جلسہ میں یہ نظر آیا کہ محمد علی صاحب اربابِ علی گڈھ کی حمایت میں ہیں، اور تنہا مولانا ابوالکلام ادھر ہیں، کہتے ہیں کہ جابجا کالج کے طلبہ جن کو ووٹ دینے کا حق نہ تھا، وہ نہایت اہتمام سے جلسہ کے اطراف میں باقاعدہ بٹھائے گئے اور انھوں نے اس قدر جلسہ پر استیلا، حاصل کرلیا کہ موافقین کا چیرز سے دل بڑھایا اور مخالفین کو "حتی حتی" کی آواز سے مبہوت کردیا، مخالفین نے ہرچند بولنے کی کوشش کی ناکامی ہوئی، یہ واقعات اس زمانہ میں نہایت اہم تھے،

مولانا کی اکثر نظمین اس مسئلہ کے متعلق طنزیہ ہیں، ان کو سمجھ کر پڑھنا چاہیئے،

یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی

کا

اجلاس لکھنو

۲۸ر دسمبر ۱۹۱۲ء

یہ فیض ہے جماعتِ احرار کا ضرور
آزادیِ خیال کا جو کچھ کہ ہے اثر
لیکن یہ دیکھنا ہے کہ یہ عزم، یہ ترنگ

اب قوم کو جو شخص پرستی سے عار ہے
یہ سب انہی کے فیض کا منت گذار ہے
ہے دیرپا کہ جوشِ جنونِ بہار ہے

اب کے جو لکھنؤ میں دکھایا گیا سماں
دیکھا یہ پہلے دن، کہ ہر اک گوشۂ بساط
غل ہے کہ وہ مقدمۃ الجیش آگیا
احرار کی صفوں کی صفیں ہیں جمی ہوئی
اسٹیج پہ ہر ایک بپھرتا ہے اس طرح
ہاتھ اٹھ رہے ہیں یا علمِ فتح ہے بلند

سچ پوچھئے تو مضحکۂ روزگار ہے
میدانِ رزم و عرصہ گہِ گیرودار ہے
اب انتظارِ فوج یمین و یسار ہے
مجلس تمام عرصہ گہِ کارزار ہے
گویا حریفِ رستم و اسفندیار ہے
چلتی ہوئی زبان ہے یا ذوالفقار ہے

؂ محمد علی صاحب،

ہر نوجوان ہے نشۂ آزادگی میں مست
جو ہے وہ حریت کا سر پر خمار ہے
احرار کہہ رہے ہیں نہ مانیں گے ہم کبھی
ویٹو کا ویسرائے کو کیا اختیار ہے
الحاق اگر نہیں ہے تو ہر سعی ہے عبث
"مسلم" کا لفظ خاص ہمارا شعار ہے
جو والیانِ ملک کہ تھے زیبِ انجمن
سب دم بخود سے تھے کہ یہ کیا خلفشار ہے

یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں
نے وہ خروش و جوش نہ وہ گیر و دار ہے
ٹوٹی ہوئی صفیں ہیں علم سرنگوں ہیں سب
بازوے تیغ گیر جو تھا، رعشہ دار ہے
"سازش" کا ایک جال بچھایا ہے ہر طرف
ہر شخص اس کی فکر میں مصروفِ کار ہے
سرمستیاں ہیں دورِ قدح ہائے راز کی
ہر شخص "حکمتِ عملی" کا شکار ہے

جو بات کل تلک سببِ ننگ و عار تھی
وہ آج مایۂ شرف و افتخار ہے
جس بات پر کہ نعرۂ نفریں بلند تھے
اب وہ قبولِ خاطرِ ہر ذی وقار ہے
کل کہہ چکے ہیں کیا؟ یہ نہیں اب کسی کو یاد
اب نکتہ ہائے زیرلبی پر مدار ہے
خود آپ اپنے ہاتھ سے کھائی ہے گو شکست
کہتے ہیں، پھر "یہ فتحِ مبیں یادگار ہے"

حیران تھے عوام کہ کیا ماجرا ہے یہ
یہ کیا دورنگیِ چمنِ روزگار ہے

احرار کا طریقِ عمل ہے اگر یہی
پھر کامیابیوں کا عبث انتظار ہے

عرضِ نیاز

بہ جناب "مالک الملک"

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

الحاق کی جو شرط نہ مانی جناب نے
کیا جانے کیا حضور کے دل میں خیال ہے

"مسلم" کے لفظ میں تو کوئی بات ہی نہ تھی
کیا اس میں بھی حضور کو کچھ احتمال ہے؟

اسبابِ سوءِ ظن کے نئے کچھ عیاں ہوئے
یا پہلے ہی سے شیشۂ خاطر میں بال ہے؟

ہم تو ازل سے حلقہ بگوشِ نیاز ہیں
یہ سر ہمیشہ زیرِ قدم پائمال ہے

ہم نے تو وہ ثنا و صفت کی حضور کی
جو خاص شیوۂ صفتِ ذوالجلال ہے

آیا کبھی نہ حرفِ تمنا زبان پر
یاں تک تو ہم کو پاسِ ادب کا خیال ہے

اردو کے باب میں جو ذرا کھل گئی زبان
اب تک جبین پہ عرقِ انفعال ہے

دامن غبارِ حق طلبی سے رہا ہے پاک
یہ فیضِ خاص رہبرِ دیرینہ سال ہے

آیا جو حریت کا کبھی دل میں وہم بھی
سمجھا دیا کہ جوششِ جنوں کا اُبال ہے

اب تک اسی طریق پہ ہیں بندگانِ خاص
گو صحبتِ عوام میں کچھ قیل و قال ہے

گردن جھکی ہوئی ہے زباں گو ہے شکوہ سنج ‏— باطن ہے انقیاد، جو ظاہر ملال ہے
الحاق سے کچھ اور نہ تھا مدعائے خاص — بس اک عمومِ درسِ وفا کا خیال ہے
یعنی کہ پھیل کر یہ زمانے کو گھیر لے — اب تک جو مختصر یہ علی گڈھ کا جال ہے
یہ پالسی ہے شاہ رہِ عام قوم کی — اس سے کوئی الگ ہو تو وہ خال خال ہے
پھر بھی حضور کی نہ گئیں سرگرانیاں — پھر بھی گناہ گار مرا بال بال ہے
اتنی سی آرزو بھی پذیرا نہ ہو سکی — اب کیا کہیں کہ اور بھی کچھ عرض حال ہے

سنتے رہے وہ غور سے یہ داستانِ غم — جب ختم ہو گئی تو یہ لب پر مقال ہے

"حد سے اگر بڑھے گا تو ہو جائے گا مسہ
وہ درسگاہِ روئے وفا کا جو خال ہے"

تقسیمِ عمل

مقدسینِ علی گڈھ کا قوم پر عتاب

مایوس گو ترقیِ قومی سے ہیں نہیں — لیکن ابھی تلک تو یہ سودائے خام ہے
رائیں تمام کچ ہیں، خیالات سب غلط — گم کردۂ نجات ہر اک خاص و عام ہے
یہ تین لاکھ قوم نے جو کر دیئے عطا — بے شبہ عزم و ہمتِ عالی کا کام ہے
لیکن یہ گفتگو جو نئی چھڑ گئی ہے اب — یہ باعثِ تباہیِ ناموس و نام ہے

الحاق کی جو شرط نہ منظور ہو سکی — اک غلغلہ ہے شور ہے غوغا عام ہے
لبریز ہے تصورِ باطل سے ہر دماغ — ہر سینہ عرصہ گاہِ ہوس ہائے خام ہے
اب اس طرح سے چلتی ہے اک ایک کی زبان — گویا کہ ذوالفقارِ علی بے نیام ہے
دو کوڑیاں بھی جس نے نہ دیں آج تک کبھی — اس کی بھی نیند جوشِ جنوں میں حرام ہے

اک غلغلہ بپا ہے کہ الحاق جب نہیں — پھر کس بنا پہ جامعۂ قوم نام ہے
اسلام کے جو نام سے بھی متسم نہیں — اس کو تو دور ہی سے ہمارا سلام ہے
مسلم نہیں تو جامعۂ قوم بھی نہیں — پھر کیوں یہ شور و غلغلہ و اہتمام ہے
چندے لئے گئے تھے اسی شرط پر تمام — یہ نقضِ عہد ہے کہ جو شرعاً حرام ہے
یہ درس گاہِ خاص نہ تھا مدعائے عام — یہ وہ متاع ہی نہیں جس کا یہ دام ہے

ان ابلہانِ قوم کو سمجھائے یہ کوئی — عالم کے کاروبار کا اک انتظام ہے
جس کی بنا تمام ہے تقسیمِ کار پر — یعنی ہر ایک شخص کا اک خاص کام ہے
عالم میں ہیں ہر اک کے فرائض جدا جدا — یہ مسئلہ مسلّمۂ خاص و عام ہے
ہے مقتدی کا فرض فقط امتثالِ امر — ارشاد و حکم منصبِ خاصِ امام ہے
تھا قوم کا جو فرض وہ تھا بس عطائے زر — آگے مقدسینِ علی گڈھ کا کام ہے
یہ بارگاہِ خاص، نہیں مجلسِ عوام — سمعاً و طاعۃً یہ ادب کا مقام ہے

مخصوص ہیں مناصبِ خاصانِ بارگاہ
تم کون ہو جو تم کو یہ سودائے خام ہے؟

مسئلۂ الحاق

مجھ کو حیرت تھی کہ تعلیمِ غلامی کے لئے — وہ نیا کون سا پہلو ہے کہ جو باقی ہے
پہلے جو بزم گہِ خاص تھی اس فن کیلئے — آج جو کچھ ہے اسی درس کی مشتاقی ہے
اس کے ہوتے ہوئے پھر لیگ کی حاجت کیا تھی — جب وہی بادۂ گلگوں ہے وہی ساقی ہے
فیض ہے عالمِ بالا کا ابھی تک جاری — استفادہ میں وہی شیوۂ اشراقی ہے
غلطی سے جو نئی چیز سمجھتے ہیں اُسے — یہ فقط وہمِ غلط کار کی خلاقی ہے

شیخ صاحب نے کہا مجھ سے باندازِ لطیف — اس میں اک راز ہے اک نکتۂ اشراقی ہے

"یوں تو ہیں جامعۂ درسِ غلامی دونوں
فرق یہ ہے کہ وہ محدود یہ الحاقی ہے"

یونیورسٹی اور الحاق

شرطِ الحاق پہ اصرار اور ایسا اصرار — شیوۂ عقل نہیں بلکہ یہ ہے کج نگہی
درسگاہیں ہیں کہاں کیجئے جن کا الحاق — اور اگر ہیں بھی تو بے کار ہیں یا طبل تہی
لوگ جس چیز کو کہتے ہیں "علی گڈھ کالج" — چشمِ بینا ہو، تو ہے جامعۂ قوم یہی
یہ وہی قبلۂ حاجات ہے سوچیں تو ذرا — یہ وہی کعبۂ مقصود ہے دیکھیں تو سہی

آج جو لوگ ہیں جمعیتِ قومی کے امام
سب کے سب متفق اللفظ یہی کہتے ہیں
جن کا ارشاد ہے ہم پایۂ طغرائے شہی
اِنَّ ھٰذا لھوالحق و امنت بہٖ

قوم کا دیکھئے بچپن کہ یہ سب سُن کے کہا
"جو کھلونا مجھے دکھلایا تھا لُوں گی تو وہی"

یونیورسٹی ڈیپوٹیشن

واقعہ یہ ہے کہ اس جلسہ میں جب تحریک یہ کی گئی تھی کہ معاملات کے تصفیہ کے لئے ویسرائے کی خدمت میں حسب ذیل ارکان کا ایک وفد بھیجا جائے، خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم نے اس کی سخت مخالفت کی، مگر جب ان کا نام بھی داخلِ وفد کر لیا گیا تو وہ فوراً سرد پڑ گئے،

تھی سفارت کی جو تجویز بظاہر موزوں
دفعۃً دائرۂ صدر سے اٹھا اک شخص
اس نے اس زور سے تجویز پہ کی ردّ و قدح
اہلِ مجلس نے جو بدلا ہوا دیکھا انداز
صدرِ محفل نے بلا کر اُسے آہستہ کہا
بادۂ جامِ سفارت سے مردافگن تھا
اب نہ وہ طرزِ سخن تھا نہ وہ آزادیِ رائے
اہلِ مجلس بھی بظاہر نظر آتے تھے خموش
جس کی آزادیِ تقریر تھی غارت گرِ ہوش
چونک اٹھے وہ بھی جو بیٹھے ہوئے تھے پنبہ بگوش
ڈر ہوا یہ کہ کہیں اور نہ بڑھ جائے خروش
"کہ تو ہم شاملِ وفدستی و ایں مایہ مجوش"
ایک ہی جرعہ میں وہ شیرِ جری تھا خاموش
نہ وہ ہنگامہ طرازی تھی نہ وہ جوش و خروش

جس کی تقریر سے گونج اٹھا تھا اجلاس کا ہال
اب وہ اک پیکرِ تصویر تھا بالکل خاموش

سخت حیرت تھی کہ اک ذرۂ خاکستر تھا
وہ شرارہ جو ابھی برق سے تھا دوش بدوش

دیکھتے ہیں تو حرارت کا کہیں نام نہیں
ہو گیا شعلۂ سوزندہ بھڑک کر خس پوش

اہلِ ثروت سے یہ کہدو کہ مبارک ہو تمھیں
للہ الحمد ابھی ملک میں ہیں رائے فروش

یونیورسٹی ڈیپوٹیشن

آپ نے بحثِ سفارت پہ جو کی تھی تقریر
تھا حقیقت میں وہی شیوۂ آزادہ وشی

دفعتہً طبعِ مبارک نے جو بدلا انداز
سب کو حیرت تھی کہ کیوں آپ نے کی کجروشی

یا تو اس زور سے تھے آپ سفارت کے خلاف
یا کہ خود آپ ہی شامل تھے اسی میں بخوشی

بادۂ جامِ سفارت طرب انگیز سہی
آپ کی شان کو زیبا نہ تھی یہ بادہ کشی

کھینچکر اک نفسِ سرد، یہ ارشاد ہوا
"ذوقِ ایں بادہ نہ دانی بخدا تا نہ چشی"

مسلم یونیورسٹی کا نصاب تعلیم

ہمارے لیڈروں کے مشغلے اب بڑھتے جاتے ہیں
کہ اب سازش کی بھی باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے

ہماری مجلسِ قومی کے جب اجلاس ہوتے ہیں
تو اخلاقی قواعد میں بھی کچھ ترمیم ہوتی ہے

بٹھائے جاتے ہیں کالج کے لڑکے صدر و پائیں
ادھر اسٹیج پر سرگوشیاں ہوتی ہیں آپس میں
طلسم چشم و ابرو کے جو اسرار نہانی ہیں
کسی پر تالیاں بجتی ہیں تحقیر و اہانت کی
کسی آزاد گو کے کان میں کچھ پھونک دیتے ہیں
شکایت ہوتی ہی جب تشنہ کامان تفاخر کو

سکھائی جاتی ہی جو کچھ نئی اسکیم ہوتی ہے
اشاروں میں ادھر فرد عمل تقسیم ہوتی ہے
نوآموزوں کو ان کی دمبدم تعلیم ہوتی ہے
کسی کی ہر ادا پر عزت و تکریم ہوتی ہے
کہ جس سے کچھ امید شیوۂ تسلیم ہوتی ہے
تو پھر جام سفارت میں بھی کچھ تعمیم ہوتی ہے

یہاں تک تو خدا کے فضل سے ہم نے ترقی کی
اب آگے دیکھئے اس فن میں کیا ترمیم ہوتی ہے

ندوۃ العلماء
کا
فتنہ ۱۹۱۴ء

مولانا مرحوم دارالعلوم ندوہ کے معتمد کی حیثیت سے مدرسہ میں جو اصلاحات کرنا چاہتے تھے بعض ارکان نے ان کی مخالفت کی اور خود مولانا پر الزامات لگائے، بالآخر مولانا نے استعفا دے دیا، طلبہ کو اس واقعہ سے سخت صدمہ پہنچا، اور انھوں نے اس کے خلاف تین ماہ تک ایسی عظیم الشان اسٹرائک جاری رکھی کہ تمام ملک ان کی صدائے فریاد سے گونج اٹھا، اور دو تین مہینوں تک تمام اردو اخبارات ان واقعات کے ذکر سے لبریز رہتے تھے، علی گڈھ کے اربابِ حلّ وعقد جو کبھی معاملاتِ ندوہ سے دلچسپی نہیں لیتے تھے، انھوں نے مخالفین کا پورا پورا ساتھ دیا، لیکن حزب الاحرار کی قیادت میں پورا ملک طلبہ سے ہمدردی رکھتا تھا، ریاستوں نے عطیے بند کر دیے،

علی گڈھ کانفرنس نے بعض ریاستوں کی تحریک سے اپنے چند عہدہ داروں کو اس غرض سے ندوہ بھیجا کہ وہ دفتر اور مدرسہ کا معائنہ کرکے روداد تیار

کریں، اور دفترِ نظامت نے یہ ننگ گوارا کیا کہ ان چند محرروں کو اپنے "مدرسۂ اعظم" کا تحقیقی معائنہ کرا کر ان سے سندِ توثیق حاصل کرے۔ ان واقعات سے متاثر ہو کر، شاعر نے یہ نظمیں کہی ہیں،

جنگِ زرگری

"حبِ علیؓ" یا "بغضِ معاویہؓ"؟

کیا لطف ہے کہ حامیِ ندوہ ہیں اب وہ لوگ
جن کو کہ اس کے نام سے بھی اجتناب تھا

وہ لوگ جن کی رائے میں یہ ندوۂ غریب
اک بیہدہ خیال تھا، یا آنکہ خواب تھا

وہ لوگ جن کی رائے میں تعلیم کا یہ طرز
اعلانِ جنگِ "سیّد" عالی جناب تھا

وہ لوگ جن کی رائے میں یہ ندوۂ حقیر
تعلیمِ مغربی کے لئے سدِّ باب تھا

وہ لوگ جن کی رائے میں ندوہ کا یہ طلسم
سر تا قدم فریبِ دہِ شیخ و شاب تھا

ندوہ کا نام سن کے جو کھاتے تھے پیچ و تاب
جن کے لئے وہ موجبِ رنج و عذاب تھا

حیرت یہ ہے کہ مجمعِ دہلی[1] میں یہ گروہ
ندوہ کے حل و عقد کا نائب مناب تھا

ندوہ پہ حرف گیر جو ہوتا تھا کوئی شخص
وہ اس گروہِ پاک کا وقفِ عتاب تھا

ندوہ میں کوئی نقص بتاتا اگر کوئی
اُن کی طرف سے ایک کا سو سو جواب تھا

سیارگانِ چرخِ علی گڑھ تھے پیش پیش
جن میں کوئی "قمر" تھا، کوئی "آفتاب" تھا

حیرت میں تھے تمام تماشائیانِ بزم
یعنی یہ کیا طلسم تھا؟ کیا انقلاب تھا؟

[1] جلسہ ۱۰ مئی ۱۹۱۲ء متعلق اسٹرائک

ندوہ کہاں، کہاں وہ علی گڈھ کی انجمن؟؟
اس بزمِ قدس میں یہ کہاں باریاب تھا؟

کس دن کی دوستی ہے، یہ کب کا ہے ارتباط؟؟
یوں کب وہ موردِ کرمِ بے حجاب تھا؟

شایانِ آفریں ہے وہی ندوۂ غریب
جو مدتوں سے موردِ خشم وعتاب تھا

سرشار ہے حمایتِ ندوہ میں وہ گروہ
جن کو کہ اس کے ذکر سے بھی اجتناب تھا

بغضِ معاویہؓ ہے، یہ حبِ علیؓ نہیں
اک ایک کی زباں پہ یہ فصل الخطاب تھا

یہ قصۂ لطیف ابھی ناتمام ہے
جو کچھ بیاں ہوا ہے یہ آغازِ باب تھا

ندوۃ العلماء

اور

ننگ معائنۂ اغیار

آتا ہے اب معائنۂ ندوہ کا مشن
جو اختراعِ مجمعِ حکمت شعار ہے

جن میں سے کچھ شریکِ نزاعِ قدیم ہیں
کچھ ابتدا سے بانیِ آغازِ کار ہے

جن میں سے کوئی محکمۂ راز کا شریک
مضمونِ آفتاب کا مضمون نگار ہے

خود کوزہ گر ہے، خود گلِ کوزہ بھی ہے وہی
جو صلح ہے، وہی روشِ کارزار ہے

کیا شانِ ایزدی ہے کہ وہ ندوۂ علوم
جو مدعیِ رہبریِ روزگار ہے

جو مایۂ امید ہے نسلِ جدید کا
جو کاروانِ رفتہ کی اک یادگار ہے

جس پہ یہ حسنِ ظن ہے کہ ہے مجمعِ کرام
جس کا کہ مصر و شام میں اب تک وقار ہے

آیا تھا جس کے شوق میں وہ فاضلِ عرب[1]
جس کا مرقّعِ ادبی المنار ہے

چلتے ہیں جس کے نقشِ قدم پر حریف بھی
گو اعترافِ حق سے ابھی ان کو عار ہے

جس نے خطابتِ عربی کو دیا رواج
جو فنِ جرح و نقد کا آموزگار ہے

جس نے بدل دیا روش و شیوۂ قدیم
یہ انقلابِ گردشِ لیل و نہار ہے

آتے ہیں اس کی جانچ کو ناآشنائے فن
جو رہبرِ طریقۂ اصلاح کار ہے

تعلیمِ مشرقی سے نہیں جن کو کچھ غرض
ندوہ اب اُن کا نازکشِ اقتدار ہے

اربابِ ریش و جبۂ اقدس کا وہ گروہ
اب چند منشیوں کا اطاعت گذار ہے

یہ داستانِ درد، یہ افسانۂ الم
ندوہ کا نوحۂ نفسِ احتضار ہے

[1] سید رشید رضا اڈیٹر المنار مصر

وفد بحضور ویسرائے

(مارچ ۱۹۱۴ء)

طرابلس، بلقان، کانپور، یونیورسٹی، ندوہ، وغیرہ ہنگاموں کے فرو ہونے کے بعد بعض رہنمایانِ قوم نے ضروری سمجھا کہ پھر حکومت اور مسلمانوں میں باہم میل ملاپ کرادیں، اس لئے ۲۵ر اپریل ۱۹۱۴ء کو "حزب الاحرار" کے بعض سرگرم ارکان کی سرکردگی میں ویسرائے کی خدمت میں ایک وفد حاضر ہوا، اور ضلع کانپور کے شکریہ، اور مسلمانوں کی وفاداری کا ایک ایڈریس پیش کیا، فرقۂ احرار کی دوسری جماعت کے ارکان نے اس میں شرکت نہیں کی، اور اس طریقۂ کار سے اختلاف کیا،

تفرقۂ حق و باطل

احرار اور، مدعیانِ وفا ہیں اور	دونوں کا ہے طریقۂ سود و زیاں الگ
دونوں کا منتہائے نظر ہے جو مختلف	ہے خود بخود ہر ایک کا طرزِ بیاں الگ
اس پر بھی صاف صاف نہ تھا امتیازِ حق	کھلتا نہ تھا کہ کون الگ ہے؟ کہاں الگ؟

دہلی کی انجمن نے وہ پردہ اٹھا دیا
قائم ہوا جو معرکۂ امتحاں الگ

اب صاف ہو گیا حق و باطل میں امتیاز
اب فصلِ نوبہار الگ ہے خزاں الگ

اب آفتابِ صدق گہن سے نکل گیا
اب شمعِ دلفروز الگ ہے دھواں الگ

وہ اختلاطِ دُردومئ صاف اب نہیں
گم گشتگانِ راہ سے ہے کارواں الگ

جو لوگ ہیں متاعِ خوشامد کے مایہ دار
کھولیں گے اب وہ ملک میں اپنی دکاں الگ

یہ مختصر فسانۂ بزمِ شبینہ ہے
سنیے گا "الہلال" میں یہ داستاں الگ

مسلم کی وفاداری

"وفد کا ایڈریس"

سچ تو یہ ہے کہ وفا کیشِ ازل ہیں ہم لوگ
ہم کو شکوہ نہیں، آئینِ جہانبانی کا

ہم نے یہ لکھ کے جو دی آپ کو تحریرِ وفا
یہ نتیجہ ہے، ہماری خطِ پیشانی کا

مشق ہے جادۂ طاقت پہ ہمیں چلنے کی
ہم سے اس راہ میں اغیار کبھی بڑھ نہ سکے

ہم نے تحریرِ وفا پڑھ کے سنائی اُن کو
کہ ذرا خط جو خفی تھا، تو وہ خود پڑھ نہ سکے

جنگِ یورپ اور ہندوستانی

اگست ۱۹۱۴ء میں بڑی لڑائی کے موقع پر کہی گئی، مولانا نے جنگِ یورپ پر فقط یہی ایک نظم لکھی تھی کہ نومبر ۱۹۱۴ء میں وفات ہی پائی،

اک جرمنی نے مجھ سے کہا از رہِ غرور
آساں نہیں ہے فتح، تو دشوار بھی نہیں

برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم
اور اس پہ لطف یہ ہے کہ تیار بھی نہیں

باقی رہا فرانس تو وہ رندِ لم یزل
آئیں شناسِ شیوۂ پیکار بھی نہیں

میں نے کہا "غلط ہے ترا دعوئے غرور
دیوانہ تو نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

ہم لوگ اہلِ ہند ہیں جرمن سے دس گنے
تجھ کو تمیزِ اندک و بسیار بھی نہیں

سنتا رہا وہ غور سے میرا کلام اور
پھر وہ کہا جو لائقِ اظہار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں"

متعلق سیاسیات

آیندہ مسلم لیگ کی صدارت

۱۹۱۳ء

لیگ نے "سلف گورنمنٹ" کی جو کی خواہش
وہ سمجھتی تھی کہ یہ طرزِ بدیع اچھا ہے

لیکن اب اس نے یہ سمجھا کہ غلط تھا وہ خیال
کہ ملازم وہی اچھا، جو مطیع اچھا ہے

اب کی ہو جائے گا اس جرأتِ بیجا کا علاج
لیگ مجرم ہے تو ہونے دو "شفیع"[۱] اچھا ہے

۱ مسلمانوں کے اس ہنگامۂ جوش میں اربابِ مسلم لیگ نے مسٹر محمد شفیع بیرسٹر لاہور (حال سر محمد شفیع ممبر اگزیکیٹو کونسل) جو مسلمانوں کے ان ہنگاموں سے الگ تھے اور اس لئے حکومت کی نظر میں محبوب تھے، مسلم لیگ کا صدر بنانا تجویز کیا، شاعر نے اس کی وجہ یہ تلاش کی ہے کہ ارکانِ مسلم لیگ کو حکومت کے پیشگاہ میں ایک شفیع کی ضرورت تھی تاکہ مسلم لیگ سے حریت و آزادی کے جو چند جرائم ہو گئے ہیں، وہ معاف ہو سکیں۔

درسِ پیشوائی کی ابجد

گورنمنٹ کی نگاہ میں عزت حاصل کرنے کا ذریعہ

میں نے یہ حضرت والا سے کئی بار کہا
مسکرا کر یہ کہا مجھ سے کہ ہاں! سچ ہے، مگر

"یہ تو اندازِ خوشامد ہے، اسے کیا کیجے
کامیابی کی یہ ابجد ہے، اسے کیا کیجے[1]"

افسونِ حریت

معتدلین سے خطاب

لاکھ آزادیٔ افکار کو روکا لیکن
غیر کمبخت تو گستاخ تھے مدت سے، مگر

یہ وہ افسوں ہے، کہ ہر شخص پہ چل جاتا ہے
اب تو کچھ آپ کے منہ سے بھی نکل جاتا ہے

حرکتِ اضطراری

کامیابی میں بس اک آدھ برس باقی ہے
اب بھی آجاتی ہے کالج[2] سے خوشامد کی صدا

لیگ سے سلسلۂ کانگرس باقی ہے
جا چکا قافلہ، اب بانگِ جرس باقی ہے

[1] یہ سیاسی پیشین گوئی کتنی صحیح ثابت ہوئی،
[2] علی گڈھ کالج جو اب علی گڈھ مسلم یونیورسٹی ہے،

رسّی کا بل

بیڑیاں اور تو کٹ جائیں گی کٹتے کٹتے
"سوٹ ایبل" کا یہ مگر سلسلۂ بے معنی

کوئی اس مرحلۂ سعی میں ناکام نہیں
ہے وہ آغاز کہ جس[1] کا کہیں انجام نہیں

سوٹ ایبل سلف گورنمنٹ

کل کہہ رہی تھی لیگ یہ احرارِ قوم سے
اب قیدِ "سوٹ ایبل" سے ہو کب دیکھئے نجات

"جو جو بلائیں[2] مجھ پہ پڑی تھیں وہ ہٹ گئیں
وہ بیڑیاں تو خیر کسی طرح کٹ گئیں"

سرسیّد کی سیاسی بلاغت
کا
آمد و آورد

کوئی پوچھے تو میں کہہ دونگا ہزاروں میں یہ بات
روشِ سیّد مرحوم خوشامد تو نہ تھی

[1] اس لئے کہ یہ آزادی اور غلامی دونوں معنوں کے لئے حد سے زیادہ وسیع ہے جب کبھی آزادی پسند اس لفظ کو بدلنا چاہیں گے کہ اس سے غلامی کی بھی تائید ہوتی ہے، غلامی پسند اس کی وسعتِ آزادی کا ظاہری نقشہ کھینچکر ہمیشہ مخالفت کرینگے، [2] یعنی آزادی کی راہ میں،

ہاں مگر یہ ہے کہ تحریک سیاسی کے خلاف
ان کی جوُّبات تھی آورد تھی، آمد تو نہ تھی

ردِّ عمل

"متین اللہؒ" اور جوشِ محمدؒ"

اعتدالؒ آنے نہ پایا ہے نہ آئے گا کبھی
یہ تو ہوتا ہے کہ اچھلے گی اسی زور سے اب
آپ کی طرح سے مجھ کو بھی یہی کھٹکا تھا
آپنے قوم کو جس زور سے دے پٹکا تھا

ناصحانِ مشفق کو دیوانگانِ حریت کا جواب

آشنائی میں تو اک عمر بسر کی میں نے
مدتوں آپنے عاقل تو مجھے دیکھا ہے
اب تو سب سے مجھے بیگانہ ہی رہنے دیجئے
اب تو کچھ دن مجھے دیوانہ ہی رہنے دیجئے

لہ سرسید مرحوم کے یہ خیالات ذاتی نہ تھے، بلکہ انگریزان کے منہ سے زبردستی کہلواتے تھے، اور سرسید کالج کی محبت میں یہ سب کچھ گوارا کرتے تھے، جیسا کہ مولانا نے اپنے مشہور سلسلۂ مضامین "مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ" میں بدلائل ثابت کیا ہے،

لہ ۱۹۱۲ء میں جب مسلمانوں میں حکومت کے خلاف انتہائی جوش تھا، اور طرابلس، بلقان، کانپور اور یونیورسٹی کے معاملات یکے بعد دیگرے پیش آرہے تھے، اور مسلمان کے آزاد اخبارات اور احرار مقررین مسلمانوں کو پورے جوش سے حریت وآزادی کی تعلیم دے رہے تھے، اس وقت صاحبزادہ آفتاب احمد خانصاحب (سابق سکرٹیری ایجوکیشنل کانفرنس و

"قال" کے بجائے "حال" درکار ہے

لیگ والوں سے کہا میں نے کہ باتیں کب تک؟ یہ تو کہئے کہ عمل کی بھی بنا ڈالی ہے؟

ایک صاحب نے کہا "آپ نہ گھبرائیں ابھی "حال" بھی آئے گا، ابتک تو یہ قوالی ہے"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۰) حال ممبر انڈیا کونسل) نے ایک رسالہ "متین اللہ اور جوشِ محمدؐ" کے مکالمہ کی صورت میں لکھا تھا، "متین اللہ" سے مقصود "وفادار اور معتدل فرقہ" علی گڈھ اور "جوشِ محمد" سے مراد "پرجوش فرقۂ احرار" تھا، اس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ مطالبات میں متانت و نرمی سے کامیابی ہوگی، جوش اور گرمی سے نہیں ۵ احرار کے فرقۂ جدید میں،

بربادیِ خانمانِ شبلی

یہ نوحہ مولانا شبلی مرحوم نے اپنے بھائی مولوی محمد اسحاق صاحب مرحوم بی اے ال ال بی وکیل ہائی کورٹ الہ آباد کی وفات پر لکھا تھا، اس مرثیہ کو پڑھ کر ہر شخص مصنف کے درد و غم کا اندازہ کر سکتا ہے، یہی غم ان کے لئے پیامِ موت ثابت ہوا، اور اس کے چند ہی مہینوں کے بعد خود انھوں نے بھی وفات پائی،

وہ برادر کہ مرا یوسفِ کنعانی تھا ۔ وہ کہ مجموعۂ ہر خوبیِ انسانی تھا
وہ کہ گھر بھر کے لئے رحمتِ یزدانی تھا ۔ قوتِ دست و دلِ شبلیِ نعمانی تھا

جوش اسی کا تھا جو مرے سرِ پرشور میں تھا
بل اُسی کا یہ مرے خامۂ پرزور میں تھا

ہم سے ناکاروں کی اِک قوتِ عامل تھا وہی ۔ مایۂ عزتِ اجداد کا حامل تھا وہی
مسندِ والدِ مرحوم کے قابل تھا وہی ۔ یوں تو سب اور بھی اعضا ہیں مگر دل تھا وہی

اب وہ مجموعۂ اخلاق کہاں سے لاؤں
ہائے افسوس میں اسحاق کہاں سے لاؤں

جب گیا والدِ مرحوم نے دنیا سے سفر
بن گیا آپ اکیلا وہ ہر آفت میں سپر
گھر کا گھر تھا ہدفِ ناوکِ صد گونہ خطر
تیر جو آئے گیا آپ وہ اُن کی زد پر

خود گرفتار رہا تاکہ میں آزاد رہوں
اس نے غم اس لیے کھائے تھے کہ میں شاد رہوں

اس کا صدقہ تھا کہ ہر طرح سے تھا میں بے غم
امن و راحت کے جو ساماں تھے ہر طرح بہم
گھر کے جھگڑوں سے نہ کچھ فکر نہ کچھ رنج والم
میں تھا اور مشغلۂ نامہ و قرطاس و قلم

اس کے صدقے سے تھی میری سخن آرائی بھی
اس کا ممنون تھا مرا گوشۂ تنہائی بھی

تازہ تھا دل پہ مرے مہدیِ مرحوم کا داغ
اس کو جنت میں جو خالق نے دیا کنجِ فراغ
کہ مرا قوتِ بازو تھا، مرا چشم و چراغ
میں یہ کہتا تھا کہ اب بھی تر و تازہ ہے یہ باغ

یعنی وہ آئینۂ خوبیِ اخلاق تو ہے!
اٹھ گیا مہدیِ مرحوم تو اسحاق تو ہے

آج افسوس کہ وہ نیّرِ تاباں بھی گیا
اب وہ شیرازۂ اوراقِ پریشاں بھی گیا
میری جمعیتِ خاطر کا وہ ساماں بھی گیا
عتبۂ والدِ مرحوم کا درباں بھی گیا

گلۂ خوبیِ تقدیر رہا جاتا ہے
نوجواں جاتے ہیں اور پیر رہا جاتا ہے

تجھ کو اے خاکِ لحد آج اجل نے سونپی
وہ امانت جو مرے والدِ مرحوم کی تھی

بسکہ فطرت میں ودیعت تھی نفاست طلبی
نازپروردۂ نعمت تھا یہ ایں سادہ وشی

دیکھنا اڑکے غبار آئے نہ دامن پہ کہیں
گرد پڑ جائے نہ اُس عارضِ روشن پہ کہیں

اس کے اخلاق کھٹک جاتے ہیں دل میں ہر بار
وہ شکر ریز تبسّم، وہ متانت، وہ وقار
وہ وفاکیشیِ احباب، وہ مردانہ شعار
وہ دل آویزیِ خو، وہ نگہِ الفت بار

صحبتِ رنج بھی اک لطف سے کٹ جاتی تھی
اس کی ابرو پہ شکن آکے پلٹ جاتی تھی

حق نے کی تھی کرم و لطف سے اس کی تخمیر
خوبیِ خلق و تواضع میں نہ تھا اس کا نظیر
بات جو کہتا تھا ہوتی تھی وہ پتھر کی لکیر
اس کی اِک ذات تھی مجموعۂ اوصافِ کثیر

بسکہ خوش طبع تھا وہ صاحبِ تدبیر بھی تھا
سچ تو یہ ہے کہ وہ نوخیز بھی تھا پیر بھی تھا

اس کو شہرت طلبی سے کبھی کچھ کام نہ تھا
وہ گرفتارِ کمندِ ہوسِ خام نہ تھا!
اس کی ہر بات میں اک لطف تھا، ابرام تھا
وہ کبھی مدعیِ رہبریِ عام نہ تھا

اس کو مطلوب کبھی گرمیِ بازار نہ تھی
اس کی جو بات تھی کردار تھی گفتار نہ تھی

اس کو معلوم جو تھا وسعتِ تعلیم کا راز
اس نے دیکھے تھے جو منزل کے نشیب اور فراز
اس نے یہ کام نئی طرح کیا تھا آغاز
مگر افسوس کہ تھا راہ میں رخشِ تگ و تاز

کوششوں کے جو نتیجے تھے اسے مل نہ سکے
ہائے وہ پھول کہ پھوٹے تھے مگر کھل نہ سکے

آہ بھائی ترے مرنے کے تھے یہ بھی کوئی دن
مسندِ حلقۂ احباب ہے سونی تجھ بن
وہ ترا اوجِ شباب اور وہ بچے کم سن
تو ہی تھا اب خلفِ صدر نشینانِ مُہن

دن جب آئے کہ تجھے رہبرِ جمہور کہوں
چرخ اب مجھ سے یہ کہتا ہے کہ مغفور کہوں

یہ بھی اے جانِ برادر کوئی جانے کا ہی طور
ابھی آنے بھی نہ پایا تھا ترے اوج کا دور
اپنے بچوں کی نہ کچھ فکر نہ تدبیر نہ غور
کیا ہوا تجھ کو کہ تو ہو گیا کچھ اور سے اور

چھوڑ کر بچوں کو بے صبر و سکوں جاتا ہے
کوئی جاتا ہے جو دنیا سے تو یوں جاتا ہے

آہ اے مرگ کسی شی کی نہیں تجھ کو تمیز
میں نے مانا ترے نزدیک تھا وہ کوئی چیز
تیری نظروں میں برابر ہے گہر اور پشیز
رحم کرنا تھا کہ چھوڑے ہیں کئی اس نے عزیز

لاڈلے ہیں کہ کسی اور کے بس کے بھی نہیں
اس کے بچے ابھی سات آٹھ برس کے بھی نہیں

اے خدا شبلی دل خستہ بایں موے سفید
مرنے والوں کو نجاتِ ابدی کی ہو نوید
لے کے آیا ہے ترے درگہِ عالی میں اُمید
خوش و خرم رہے چھوٹا یہ مرا بھائی جنید

لکھوں قصۂ غم تاب رقم بھی تو نہیں
اب مرے خامۂ پرزور میں دم بھی تو نہیں

عجم کی مدح[1] کی، عباسیوں[2] کی داستاں لکھی | مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرۃِ پیغمبرِ خاتم | خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

فرشتوں میں یہ چرچا ہے کہ حالِ سرورِ عالم | دبیرِ چرخ لکھتا، یا کہ خود روح الامیں لکھتے
صدا یہ بارگاہِ عالمِ قدوس سے آئی | کہ "یہ ہے اور ہی کچھ چیز، لکھتے تو ہمیں لکھتے"

---

[3]

. . . . | . . . .
. . . . | فرشتے میرے ہاتھوں سے مثنیٰ لیتے جاتے ہیں

---

۱ شعر العجم کی پانچ جلدیں لکھیں۔ ۲ المامون عباسی کی سوانح عمری۔ ۳ افسوس ہے کہ یہ قطعہ نہیں ملا، سنہ ۱۹۱۲ء میں زمیندار یا ہمدرد میں چھپا تھا، جامعِ اوراق کو صرف آخری مصرع یاد ہے، ناظرین میں سے جن صاحب کو یہ قطعہ مل جائے، اس کے بقیہ مصرع لکھ لیں اور مجھے بھی اطلاع دیں تو عین نوازش ہوگی،

سیرۃ نبوی

اور

ہزہائینس سرکار بھوپال

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہرصورت
کہ ابرِ فیضِ سلطانِ جہان بیگم زرافشاں ہے

رہی تالیف وتنقیدِ روایتہائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہی، مری جاں ہے

غرض دو ہاتھ ہیں، اس کام کے انجام میں شامل
کہ جن میں اِک فقیرِ بے نوا ہے، ایک "سلطاں" ہی

سانحۂ گزندِ پا

ہلنا بھی جگہ سے گرچہ اب ہے دشوار
اس پر بھی خدا کا شکر ہے احسان ہے

یعنی کہ پہنچ چکا ہوں جس منزل تک
یاں سے سفرِ عدم بس اب آسان ہے

ہر چند کہ زخم سخت جاں فرسا تھے
آثارِ ہلاک سر بسر پیدا تھے

ممنون ہوں ضبط کا کہ اس حال میں بھی
گو پانوں کٹے، مگر قدم بر جا تھے

مقبول نہیں ہے بے نوائی میری
آلودۂ نخوت ہے گدائی میری
تقدیر نے پاؤں کاٹنے پر بس کی
ناقص ہے ابھی بے سروپائی میری

طلبائے ندوہ
سے
خطاب

کئے تھے ہم نے بھی کچھ کام جو کچھ ہم سے بن آئے
یہ قصہ جب کا ہے، باقی تھا جب عہدِ شباب اپنا
اور اب تو سچ یہ ہے جو کچھ امیدیں ہیں وہ تم سے ہیں
جواں ہو تم، لبِ بام آچکا ہے آفتاب اپنا

ناتمام نظمیں

نالۂ شبلی

غالباً اپنے مرحوم بھائی کا مرثیہ اس طرز میں کہنا چاہا تھا

وہ بھی تھا ایک دن کہ یہ وحشت سرائے دل — اک محشرِ نشاط و وفورِ سرور تھا
رنگینیِ خیال سے لبریز تھا دماغ — جو شعر تھا چراغِ شبستانِ حور تھا
سینہ میں تھا چمن کدۂ صد امیدِ نو — آنکھوں میں کیفِ بادۂ ناز و غرور تھا
اک ایک برگ تھا ورقِ نوبہارِ حسن — ذرّوں کے رُخ پہ صبحِ سعادت کا نور تھا

دیگر

معلوم نہیں ان اشعار میں کن واقعات کی طرف اشارہ ہے

اک شہر میں کہ پایۂ تختِ قدیم ہے — پچھلے پہر سے آج عجب شور و شین ہے
پرچم ہے، بیرقیں ہیں، علم ہیں، نشان ہیں — غل ہے کہ آج عیش ہی، راحت ہی چین ہے
مسند نشیں ہے تختِ حکومت پہ جلوہ گر — دربار ہے کہ جلوہ گہِ زیب و زین ہے

ہیں بے نقاب پردگیانِ حریم قدس، جن کی زبان پہ شور ہے، نوحہ ہے، بین ہے

تاکید ان پہ ہے کہ ادب سے کھڑی رہیں یعنی کہ احترام شہی فرضِ عین ہے

دیگر

ترکوں کے فتوحات

یہ نظم غالبًا جنگ روم وروس، یا جنگ روم و یونان کے زمانہ میں یعنی ۱۸۷۷ء میں لکھی جاہی ہوگی، یہ علی گڈھ جانے سے پہلے کا کلام ہے، مولانا کے بعض اعزہ کے پرانے کاغذات سے ہاتھ آئی ہے،

گذری دلِ سپہر سے نوکِ سنانِ ترک اور حلقۂ نجوم سے تیرِ کمانِ ترک

گردانِ نامدار ہیں گردن کشانِ ترک شیرانِ کارزار ہیں، زورآورانِ ترک

لرزے ہیں ان کے رعب سے دشتِ مصاف سے،

خوں، اُن کی تیغِ کیں سے دلِ کوہ قاف سے،

مطائبات

حضرت اکبر الٰہ آبادی کے رقعۂ دعوت کا جواب

بعد از حادثۂ گزند پا

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں

آپ کے لطف و کرم کا مجھے انکار نہیں
حلقہ در گوش ہوں ممنون ہوں مشکور ہوں میں

لیکن اب وہ میں نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا
اب تو اللہ کے افضال سے "تیمور" ہوں میں
یعنی لنگ

دل کے بہلانے کی باتیں ہیں وگرنہ شبلی
جیتے جی مردہ ہوں، مرحوم ہوں مغفور ہوں میں

عطیہ بیگم (بمبئی) کی شادی

بمبئی کی مشہور مسلمان خاتون عطیہ بیگم کی شادی ایک نومسلم یہودی نقاش و مصور سے ہوئی، اس پر شاعر نے نئے نئے مضامین پیدا کر کے عطیہ بیگم کو تحفہ بھیجا

(بہ زبان عطیہ بیگم)

"کھینچ" سکتا جو نہ تھا مجھ کو کوئی اپنی طرف
اس لئے ننگ قرابت سے مجھے دوری تھی

آپ "نقاش" ہیں اور حسن کی تصویر ہوں میں
آپ نے مجھ کو جو "کھینچا" تو یہ مجبوری تھی

بتان ہند کافر کر لیا کرتے تھے مسلم کو
عطیہ کی بدولت آج اک کافر مسلماں ہے

بعض ادبی کتابیں

کلیات شبلی فارسی

مولانا شبلی مرحوم کے تمام فارسی قصائد، غزلیات، مثنویات اور قطعات کا مجموعہ
جو اب تک متفرق طور سے دیوان شبلی، دستۂ گل، بوے گل، برگ گل کے ناموں
سے چھپے تھے، اس میں سب یکجا کر دیئے گئے ہیں، قیمت :- عہ

مقالاتِ شبلی حصّہ دوم

یہ مولانا کے ادبی مضامین کا مجموعہ ہے، ضخامت ۴۰۳ صفحے، قیمت : ۱۲ر

نقوش سلیمانی

یہ مولانا سید سلیمان ندوی کی ہندوستانی اور اردو زبان و ادب
سے متعلق تقریروں، تحریروں اور مقدموں کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے بعض
ادبی کتابوں پر لکھے، قیمت : ہیہ ضخامت ۵۰۰ صفحے،

خیام

خیام کے سوانح، تصنیفات اور فلسفہ پر تبصرہ اور فارسی رباعی کی تاریخ اور
رباعیات خیام پر مفصل مباحث اور آخر میں خیام کے چھ عربی و فارسی رسالوں کا
ضمیمہ اور اس کے قلمی رباعیات کے ایک نسخہ کی نقل شامل ہے، خیام کے مباحث پر اس سے
زیادہ مفصل، مکمل اور محققانہ کتاب اب تک نہیں لکھی گئی، قیمت مجلد للعہ غیر مجلد ہیہ

مسعود علی ندوی، منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(طابع و ناشر محمد ادریس وارثی)